



اساتذہ کرام مجلس اعلیٰ اسلامیہ تحقیقات
پنجاب لاہور، پاکستان

۱۳

غالب

ذاتی تاثرات کے آئینے میں

عالم

ذاتی تاثرات کے آئینے میں

طابع : سید الطہار الحسن رضوی
مطبع عالیہ ۵/۱۲۰ شمیل روڈ ، لاہور



مطبوعات مجلس اوقاف و کار خیرات
پنجاب ریور سٹی، لاہور

۱۳

غالب ذاتی آثار اشعار کے آئینے میں

ترجمہ:

عبدشکور حسن

سجاد باقر ضوی

۱۹۶۶ء

مجلس یادِ کارِ غالبؔ

★

صدرِ مجلس

پروفیسر محمد محمد خان ستارہ لکھستان وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی لاہور

ارکان

جناب عبد الرحمن چغتائی لاہور

مولانا غلام رسول مہر لاہور

پروفیسر اکرم سعید اللہ سابق صدر شعبہ فلسفہ اسلامیہ کالج رسول لائسنز لاہور

سید امتیاز علی تاج ہیکر ٹری مجلس ترقی ادب لاہور

مولانا حامد علی خان، مدیر موشم مطبوعات فریگلن لاہور

کیپٹن عبد الواحد موشم مطبوعات فریگلن لاہور

ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمن، سابق چیف جسٹس پاکستان لاہور

پروفیسر اکرم قاضی سید الدین احمد صدر شعبہ اصولیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

گرو کیپٹن سید فیاض محمود ناظم شعبہ تاریخ ادبیات پنجاب یونیورسٹی لاہور

پروفیسر اکرم سید عبداللہ صدر دائرۃ المعارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

ڈاکٹر شیخ محمد اکرام ناظم ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور

پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر نسپ، پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج، صدر شعبہ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور
سید وقار عظیم، غالب، فیس اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور

سید وزیر الحسن عابدی، ریڈر شعبہ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور
جناب احمد ندیم قاسمی، مدیر مجلہ فنون لاہور

پروفیسر ڈاکٹر عبادت بریلوی، صدر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور
جناب صفدر میر، روزنامہ پاکستان لاہور

پروفیسر ڈاکٹر محمد اجمل، صدر شعبہ نفسیات، گورنمنٹ کالج لاہور
پروفیسر اختر اقبال، کمالی شعبہ انگریزی اسلامیکہ کالج سول لائسنز لاہور
ڈاکٹر وحید قریشی، ریڈر شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی لاہور

جناب انتظار حسین، روزنامہ مشرق لاہور
جناب اقبال حسین، شعبہ تاریخ ادبیات پنجاب یونیورسٹی لاہور
مفت محمد

ڈاکٹر افتاب محمد خان، جوائنٹ سیکرٹری وزارت اطلاعات و نشریات حکومت پاکستان
ڈاکٹر عبد الشکور احسن، ریڈر شعبہ فارسی پنجاب یونیورسٹی لاہور
نائب محمد

سید سجاد باقر رضوی، لیکچرار انگریزی یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

پیش لفظ

مجلس یادگارِ غالب کا قیام پنجاب یونیورسٹی کے ایک فیصلے کے مطابق عمل میں آیا اور پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اس کے صدر مقرر ہوئے۔ مجلس نے غالب کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے جو کتابیں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا انہیں میں غالب شناسوں کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔

یونیورسٹی کے ایک اور فیصلے کی رُو سے شعبہ اردو میں کرسیِ غالب قائم ہوئی۔ میں مسرت کے ساتھ اعلان کر رہا ہوں کہ اس اسمیٰ پر پروفیسر سید وقار عظیم کا تقرر کیا جا چکا ہے۔

(پروفیسر) علامہ الدین صدیقی

وائس چانسلر، جامعہ پنجاب

لاہور

مینٹ ہال

برج ۱۹۶۹ء

اعجاز



فروری ۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کی وفات پر ایک سو برس پورے ہوئے ہیں۔ اس موقع کی مناسبت سے پنجاب یونیورسٹی نے شاعر کی عظمت کے اعتراف کے طور پر نہ صرف شعبہ اُردو میں ایک پروفیسر کی نئی اسامی (کرسٹی چھان) قائم کی ہے، بلکہ مجلسِ یادگار غالب کے تعاون سے ایک سلسلہ مطبوعات شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مجلسِ یادگار غالب کے قیام کی تحریک جنوری ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر آفتاب احمد خان نے کی۔ وہ مجلس کے پہلے معتمد اور سید سجاد باقر رضوی شریک معتمد مقرر ہوئے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد خان کے لاہور سے ڈھاکے منتقل ہو جانے پر ڈاکٹر عبدالحکیم صاحب کو راجن مجلس کے دوسرے معتمد قرار پائے۔

اواخر ۱۹۶۶ء میں جب ہمارا سلسلہ کتب طباعت کے مرحلے میں داخل ہوا تو صدر مجلس کو ڈاکٹر محمد باقر کی مسلسل اعانت اور مشورہ بھی قدم قدم پر پمیر رہا۔ جن ارباب فکر و نظر نے مجلس کی درخواست پر اس سلسلہ کتب کی ترتیب تالیف یا تصنیف میں حصہ لیا ان میں سے ہر ایک کا نام متعلقہ کتاب کے سرورق

کی زمینیت ہے مجلسِ یادگار غالب کے ارکان کے ناموں کی پوری فہرست
اس کتاب کے شروع میں الگ شائع کی جا رہی ہے۔

مجلس کے سلسلہ مطبوعات میں سب سے پہلے مرزا غالب کی تصانیف آتی
ہیں جو اُردو اور فارسی نظم و شریعتی ہیں۔ یہ تصانیف نفسِ مضمون کی رعایت
سے یا موزونیِ ضخامت کا لحاظ کر کے مختلف جلدوں میں تقسیم کر دی گئی ہیں

ان سب کتابوں پر موصوفین نے دیباچے لکھے ہیں اور حسبِ ضرورت حواشی کا
اضافہ بھی کیا ہے۔ نیز جہاں تک ممکن ہو سکا دستیاب وسائل کی مدد سے
برقن کی تصحیح کی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ مرزا غالب کی تصانیف میں

سے کوئی کتاب روزِ جائے چنانچہ اُن کی بعض نگارشات جو مرورِ زمانہ
سے تقریباً ناپید ہو چکی تھیں، اب پھر اہل نظر کے ہاتھوں میں پہنچ رہی ہیں۔
دیوانِ غالب کا نسخہ تجدید، جسے صدرِ مجلس نے مرتب کیا ہے، ایک پہلے

قیصلے کے مطابق مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، کی طرف سے شائع ہو رہا ہے۔
غالب کی صرف یہی ایک کتاب مجلسِ یادگار غالب کی مطبوعات میں شامل نہیں۔

مرزا غالب کی تصانیف کے علاوہ مجلس کی مطبوعات میں وہ کتابیں
بھی شامل ہیں جن میں اس گیارہ روزگار کے شخصی، فنی اور فکری کمال کا اظہار
کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو انگریزی دان لوگ اُردو نہیں جانتے نہیں

غالب کے فکر و فن سے متعارف کرنے کے لئے ایک مفصل کتاب انگریزی زبان میں شائع کی جا رہی ہے۔ ایک اور کتاب میں غالب پر شائع شدہ مواد کے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ پھر اس سوال کا جواب کہ ”میں نے غالب سے کیا پایا“ ایک تیسری کتاب کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ اس میں متعدد غالب شناس حضرات کے ذاتی تاثرات جمع کئے گئے ہیں۔ اسی طرح ایک اور مجموعے میں گذشتہ ایک سو برس کی تنقید غالب کا خاکہ اقتباسات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ کتابیں فروری ۱۹۶۹ء میں شائع ہو رہی ہیں۔ گویا ان کی تاریخِ امتحان سے مرزا غالب کی حیاتِ بعدِ ممات کی دوسری صدی شروع ہوتی ہے مجلس کو یقین ہے کہ اس دوسری صدی میں غالب کے قبولِ عام کی سرحدیں کچھ اور وسیع ہو جائیں گی۔ خدا کرے کہ دُنیا کو ہندو اسلامی تمدن کے آخری ترجمان سے روشناس کرانے میں مجلس کی یہ سعی راجگانِ بجائے

حمید احمد خان
صدر مجلس یادگار غالب
جامعہ پنجاب، لاہور

سینیٹ ہال
فروری ۱۹۶۹ء

فہرست

- ڈاکٹر محمد اقبال ، ۱
 پروفیسر حمید احمد خاں ، ۳
 مولانا غلام رسول مہر ، ۱۱
 میاں بشیر احمد ، ۱۹
 ڈاکٹر محمد وحید مرزا ، ۲۹
 علی عباس حسینی ، ۳۹
 جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان ، ۴۹
 ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد ، ۵۵
 ڈاکٹر سید عبداللہ ، ۶۱
 مولانا سعید احمد اکبر آبادی ، ۸۱
 ڈاکٹر محمد باقر ، ۹۱
 سید وقار عظیم ، ۹۵
 ن۔ م۔ راشد ، ۱۰۱
 احمد ندیم قاسمی ، ۱۰۷
 اختر حسین رائے پوری ، ۱۱۵
 شیخ منظور الہی ، ۱۱۹
 الطاف گوہر ، ۱۲۵
 ڈاکٹر محمد اجمل ، ۱۳۱
 ڈاکٹر شمس الدین صدیقی ، ۱۳۵
 صدیق کلیم ، ۱۴۳
 ڈاکٹر وزیر آغا ، ۱۴۹

جیلانی کامران ، ۱۵۵
ڈاکٹر فرمان فتحپوری ، ۱۶۳
لطیف حلیقی ، ۱۷۳



دیباچہ

غالب کی زندگی اور کلام کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا جانا رہا ہے ، لیکن شاعری میں معاشرتی و تاریخی ضرورت نہیں ہوتی ، ذاتی اور انفرادی ضرورت بھی ہوتی ہے ۔ قاری کا شاعر کے ساتھ ایک ایسا انفرادی تعلق بھی ہوتا ہے جس کا تنقیدی اظہار (خواہ)، تاثراتی تنقید کی ذیل میں کیوں نہ ہو) ممکن ہی نہیں ہوتا ۔ اس بات کے پیش نظر ”مجلس یادگار غالب“ نے یہ طے کیا کہ غالب سے متعلق اس دور کے اہل قلم اور اہل ذوق حضرات کے ذاتی تاثرات پر مشتمل مختصر مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کیا جائے ۔ یہ کتاب ایسے ہی مختصر مضامین کا حاصل ہے جن میں مختلف اہل قلم اور اہل ذوق اصحاب نے غالب سے اپنی انفرادی و ذاتی وابستگی کا اظہار کیا ہے ۔

کسی شاعر کی عظمت کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ وہ آپ کی عمر کی کن منزلوں تک آپ کا ساتھ دے سکتا ہے ۔ اسی تناسب سے آپ کی ذات کے لیے شاعر اہم یا غیر اہم ہو سکتا ہے ۔ غالب کے متعلق اس کتاب میں شامل مضامین کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوگا کہ کس طرح یہ عظیم شاعر مختلف اہل قلم حضرات کو ایک عمر متاثر کرتا رہا ہے ۔ یوں تو ذوق کے قوانین اخلاقی قوانین کی طرح ہمہ گیر نہیں ہوتے تاہم ذوق کی تربیت میں یہ ضرور ہوتا ہے کہ عمر کے مختلف حصوں

میں مختلف شعرا قاری کے دل و دماغ کو مسح کرتے رہتے ہیں۔ بالغ ذوق کے معنی یہ ہیں کہ ایک عمر کے مطالعے اور تجربے کے بعد آپ شعرا کی درجہ بندی کر لیتے ہیں، کچھ کو معیار کے اعتبار سے زیادہ بڑا درجہ دیتے ہیں اور کچھ کو نسبتاً کم تر سطح پر رکھتے ہیں۔ غالب کے متعلق اس کتاب کے مختصر مضامین میں درج شدہ تاثرات اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ وہ با ذوق قارئین کا تمام عمر کا ساتھی ہے۔ لہذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کم از کم غالب کی تحسین کے متعلق ذوق کا قانون، اخلاقی قانون کی طرح ہمہ گیر ہے۔

غالب بچپن کا ساتھی، جوانی کا دوست اور بڑھاپے کا ہم نوا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ذوق کی تربیت کے کسی مرحلے پر بھی غالب سے قطع نظر ناممکن ہے۔ بزم سرود ہو یا محفل سماع، خلوت ہو یا جلوت، اعلیٰ غور و فکر کی ہموار سطح ہو یا جذبہ و احساس کی جولانی، غالب یہ ہر عنوان غالب ہے۔ غالب برصغیر میں مسلمانوں کے تقریباً ہزار سالہ تمدن کے طرز احساس کی تخلیق ہے۔ اس تخلیق کے بچھے وہی محرکات و عوامل کارفرما ہیں جنہوں نے تاج محل، لال قلعہ، شاہی مسجد اور شالیار باغ کی تخلیق کی۔ غالب نے اپنے کلام میں دم توڑتے ہوئے عظیم تمدن کی تہذیب اور اس کے طرز احساس کو سمیٹ لیا، تاہم غالب جدید طرز احساس کی ابتدا بھی ہے۔ یوں اس کے ذریعے ماضی کے احساس کی تاریخ حال سے اپنا رشتہ استوار کرتی ہے۔ وہ انسانی اسکانات اور انسانی قوتوں کا شاعر ہے اور اسی لیے روشن مستقبل کی جانب بھی نگاہ رکھتا ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ماضی، حال اور

مستقبل تینوں زمانوں پر محیط ہے اور یہ بھی کہ غالب
 زمان و مکان کے قیود سے ماورا ایک ہمہ سطحی و ہمہ جہتی
 استعارہ ہے ۔ یہی سبب ہے کہ آج سو برس بعد ہم غالب کو
 خراج تحسین پیش کر رہے ہیں اور اس کتاب میں شامل مضامین
 جو پختہ ذوق اور بالغ لفظ اصحاب کے تاثرات کا نتیجہ ہیں ،
 غالب کو عمر کی ہر منزل پر رفیق و ہم نوا ثابت کرتے ہیں ۔

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج
 لاہور

سجاد باقر رضوی

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرچہِ چمنِ نیل کی رسائی تاکہا

تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن سپیکرِ ترا زیبِ محفل بھی ہوا، محفل سے پنہاں بھی ہوا

دید تیری آنکھ کو اُس حسن کی منظور ہے

بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری ربط سے ہے سزا دیا جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کھسکا

تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی ہوا تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالمِ سبزِ ہوا

زندگیِ مضرب ہے تیری شوخیِ تحریر میں

تابِ گہ یابی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

لفظ کو سونا زہیں تیرے لبِ عجاظ پر محو حیرت ہے ثریا رفعتِ پُرا ز پر

شاہِ مضمونِ تصدق ہے تیرے انداز پر خندہ زن ہے غنچہ دلی گلِ شیراز پر

آہ! تو اجڑی ہوئی دلی ہیں را سید ہے

گلشنِ ویر میں تیرا ہم نوا خوابید ہے

لطفِ گویائی میں تیری ہنسی مگن ہیں ہر تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشین

ہائے! کیا ہو گئی ہندوستان کی زمر میں آہ! اے نظارہ آموز نگاہِ نکست ہیں

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

شمعِ یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

اے جہان آباد! اے گوارہ علم و فن ہیں سراپا نالہ خاموش تیرے نام و دم

قدرے فقے میں تے خوابید ہیں شمس و قمر یوں تو پوشید ہیں تیری خاک میں لاکھوں گھر

دفنِ تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے

تجھ میں نہاں کئی موتی آباد ایسا بھی ہے

ویر۔ جرنی کا مشورہ شمار گوشتے اس جگہ دفن ہے۔

اگر آپ یہ دریافت کریں کہ غالب کے نظام جذبہ و فکر سے مجھے کیا حاصل ہوا ، تو میرے لیے اس سوال کا سیدھا سادھا مختصر جواب دینا دشوار ہوگا ۔ اس دشواری کا ایک سبب تو یہ ہے کہ غالب کے ساتھ میرے دل و دماغ کا معاملہ نصف صدی سے بھی پرانا ہے اور بچاس برس کے معاملات دو چار لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتے ۔ پھر غالب کا تحلیل انسانی فطرت کے اتنے بے شمار پہلوؤں کو محیط ہے کہ صرف اپنے ڈھب کے کوائف کا ذکر بھی کیجیے تو اس کے لیے مہلت درکار ہے ۔ میرے نزدیک غالب کا یہ کمال حیرت انگیز ہے کہ گو میری زندگی نے کئی پلٹے کھائے مگر عمر کے کسی مرحلے میں بھی غالب نے میرا ساتھ نہ چھوڑا ۔

لڑکپن کے زمانے میں جب میں ابھی مدرے میں پڑھتا تھا غالب کے شامل نصاب ، نام نہاد آسان اشعار میرے لیے باعث دل چسپی نہ تھے ۔ کم از کم مجھے اب یاد نہیں ہے کہ ”پھر اس انداز سے ہمارا آئی“ وغیرہ اشعار سے میں کس قسم کا لطف اٹھاتا تھا ۔ ہاں جو شعر سمجھ میں نہ آتے تھے ان کا کیف و سرور

اب تک ذہن میں محفوظ ہے ۔ مثال کے طور پر یہ شعر
لیجیے —

غنچہ تاشگفتہا برگ عاقبت معلوم !
باوجود دل جمعی خواب گل پریشان ہے

میں لڑکپن کے دنوں میں اس شعر کے معنی مطلق نہ سمجھتا
تھا مگر اس کے لفظوں کا طالع اور اس کی آواز کا نغمہ مجھے
بہت متاثر کرتا تھا ۔ اب بھی وہ نوجوان طفل مکتب جو غالب
کے سمجھ میں نہ آنے والے اشعار کے خالص صوتی آہنگ اور
خوب صورت لفظی ترکیبوں کے اشارات و کنایات پر جھوم
اٹھتا تھا ، میری روح کی گہرائیوں میں زندہ سلامت موجود
اور نہ صرف موجود ہے بلکہ شکر گزار ہے کہ غالب کی
موسیقی کے ساتھ اُس کے ان اولین تجربات نے ایسے آردو اور
فارسی نظم کے لاتعداد معنوی محاسن سے آشنا کیا ۔ اب غالب
کے منطقی مفہوم کی سرحدوں میں داخل ہونے کے بعد بھی
مجھے غالب کی لازوال موسیقی کی گونج غالب کے اشعار میں
اپنی وہی پہلی تازگی لیے ہوئے سنائی دیتی ہے :

ہے موج زن اک قلزم خوں ، کاش بھی ہو !

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا !

آن راز کہ در سینہ نهالست نہ وعظ است
بردار توان گفت و ہمچو نتوان گفت

باغ میں مجھ کو نہ لے جا ، ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ تر ایک چشمِ خون فشان ہو جائے گا

اوائلِ سنِ شعور میں غالب کے کلام کے جس پہلو نے
مجھے بہت زیادہ متاثر کیا وہ مادی کائنات کی وسعتوں پر غالب
کے ذہن کی گرفت تھی ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جدید طبیعیات
کے انکار لوجوانوں کو یہ سمجھا رہے تھے کہ ہماری کائنات کچھ
ایسی نامحدود بھی نہیں ہے ۔ یہ آسمان و زمین اور یہ تمام سورج
چاند ، ستارے ، باوجود اپنی ظاہری عظمت کے ، پوری کائنات
کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے ۔ اس قسم کا کائناتی احساس
غالب کے ابتدائی اشعار میں بھی بدرجہٴ کمال ملتا ہے :

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم ، پارِ ؟

سہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزار بادِ یاں

نہ بوجھِ وسعتِ میخافہٴ جنوں غالب
جہاں یہ کاسہٴ گردوں ہے ایک خاکِ انداز

غور کیجیے تو اس قسم کے مصرعے جیسے ”نہیں کے اور

ستارے اب آسمان کے لیے ”غالب کے شعور کی اسی عظیم کائناتی کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔

عالم طبیعی کے اس مجموعی تصور کے علاوہ دیوان غالب میں مظاہر فطرت کا ہر لطف مشاہدہ بھی اس دور میں میرے لیے بہت باعث کشش ہوا۔ اس انداز نظر میں اس قبیل کے اشعار شامل ہیں جیسے :

”بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاہاں ہوتا“

”ہر لگ کالغذ آتش زدہ لیرنگ بیتابی“

اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

یا

”سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند“

اسی زمانے میں میرے لیے غالب کے مطالعہ فطرت انسانی کے ساتھ غالب کے مشاہدہ فطرت کا لطف بھی شامل ہو گیا۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے اور اس کا کیف و سرور میرے دل میں ہمیشہ تازہ رہا ہے :

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

وہ اک نکتہ کہ بظاہر نکتہ سے کم ہے

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

تو نے قسم مے کشی کی کھائی ہے غالب
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے !

فطرت انسانی کی ان جھلکیوں کو غالب بارہا ایک
فلسفیانہ رنگ دے دیتا ہے ۔ مثلاً

در دل سنگ بنگرد رقص بتان آذری

عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا !
اور بھر عقل سلیم کو جو سہارا ان فیصلوں سے ملتا ہے وہ
سلاست طبع کا ایک خاص رنگ پیدا کرنے میں باعث مدد
ہوتا ہے :

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ

متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں فرض رازن ہر

غالب کے اس قسم کے اشعار میں بارہا ایک ایسی وسعت
منسرب کی تلقین ملتی ہے جسے غالب کے ضابطہ اخلاق کا
رکن اعظم قرار دینا چاہیے ۔

مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاؤ برہمن کو

دلہ در کعبہ از لنگی گرفت آوارہ سی خواہم
کہ ہامن قصہ بت خالہ ہائے ہند و چین گوید

جائتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبع ادھر نہیں آتی

غم کے جو اشعار غالب میں ملتے ہیں ان سے مجھے خاص
موقعوں پر دلی تسکین حاصل ہوتی ہے :

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ ٹھہتا

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکان

پیکاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

بعض قارئین نے احساس غم کی اس بے مثال لطافت کو
غالب کا مبتدا و منتہا قرار دیا ہے۔ لیکن یہ رائے درست نہیں
ہے۔ غالب نہ صرف آتش غم کے سوز و گداز سے واقف ہے
بلکہ اس آگ کی بیٹی سے سچی انسانی عظمت کا کندن بھی
نکال لاتا ہے :

ہے غم نہاد مرد گواہی نمی شود
زہار قدر خاطر اندوہ گین شناس

خون جگر بجائے مے مستیؔ ما قدحِ نداشت
 لالہؔ دل نوائے نے راسخِ ماؔ غچکِ خواست

مژدہ صبحِ درینِ تیرہ شبانم دادلد
 شمعِ کشتند و ز خورشیدِ نشانم دادند

نہیں بہار کو فرصتؔ نہ ہوؔ بہار تو ہے
 طراوتِ چمن و خوبیؔ ہوا کھپے

زندگی کی تلخیوں سے اس طرح عبرت اندوز ہونے کے بعد
 غالب اپنے قاری کو اس مقام پر بھی لے جاتا ہے جہاں سکون
 روح اور طہایتِ قلب ایک مستقل کیفیت رکھتے ہیں :

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
 بے لیاہی تری عادت میں سہی

تاجرِ شوقِ بدان رہ بہ تجارتِ لرود
 کدہ رہ انجمد و سرمایہ بغارتِ لرود

اس مقام پر پہنچ کر غالب کا آخری مشورہ یہ معلوم
 ہوتا ہے :

نہ سنو گر برا کہے کوئی
 نہ کہو گر برا کرے کوئی
 روک لو گر غلط چلے کوئی
 بھٹی دو گر خطا کرے کوئی

مولانا غلام رسول مہر

در عرض غمت بیکر اندیشه لالم
پاتا سرم انداز بیان است و بیان نیست

میں مشن ہائی سکول چالندھر کی نویں جماعت میں پڑھتا تھا ، جب شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا - (۱۹۰۹ء) خاسن علی خاسن کا دیوان کہیں سے ہاتھ آ گیا تھا ، اس کی غزلوں پر طبع آزمائی کر کے شوق کی پیاس بجھانا - یقین ہے کہ جو کچھ کہتا تھا ، وہ قابلِ توجہ نہ کیا ، غالباً صحیح بھی نہ ہوگا - تاہم خوب یاد ہے کہ اپنی ہر غزل کئی کئی مرتبہ صاف کالجزوں پر لکھ لکھ کر خوش ہوتا تھا - گویا ” طفلِ خود نما “ کا سا معاملہ تھا :

ایک حرف خواندہ ایم و ہمد جا نوشتہ ایم

کچھ عرصے کے بعد خیال آیا کہ اس ” لک بندی “ کے متعلق کسی سے مشورہ ضرور کر لینا چاہیے - ایک ہم جماعت سے بات کی تو اس نے مولانا حکیم محمد سلیم کی بارگاہ میں حاضری کی صلاح دی ، جو ہستی غذاں میں رہتے تھے اور ہستی غذاں ،

مشن ہائی سکول سے زیادہ دور نہ تھی ۔

مولانا سلیم عربی ، فارسی اور اردو کے تو فاضل تھے ہی ، بھاشا بھی خوب جانتے تھے اور چاروں زبانوں میں شعر کہتے تھے ۔ میں نے انہیں تفسیر ، حدیث ، فقہ ، تاریخ وغیرہ مختلف علوم پر بے تکلف فاضلانہ گفتگو کرتے ہوئے بارہا سنا ، ہیئت و جفر میں بھی انہیں دست گاہ حاصل تھی ۔ فن خطاطی میں بھی ماہر تھے ۔ ایک روز میری نظر اچانک ان کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر پڑی تو معلوم ہوا ناخن بہت بڑھا ہوا ہے ۔ میں نے سمجھا اتفاق سے ناخن ترشوانا بھول گئے ۔ ان سے ذکر کیا تو چپ چاپ سفید کاغذ کا ایک ٹکڑہ آٹھایا جو سامنے پڑا تھا اور چند لمحوں میں اس پر اچھد کے نہایت خوبصورت نقوش ناخن سے بنا دیے ۔ طب کو تو انہوں نے پیشے کے طور پر اختیار کر لیا تھا اور مشہور تھا کہ تشخیص و تجویز میں ان کا مرتبہ بہت بلند ہے ۔

میں ان کی خدمت میں پہنچا تو عمر ستر کے قریب معلوم ہوئی تھی ۔ ہال بالکل سفید ہو چکے تھے ۔ اگرچہ صحت اچھی تھی ، تاہم آٹھنے پٹھنے میں خاصا تکلف محسوس کرتے تھے ۔ علم و فضل کے ہا وصف ان کی آمدنی بہ مظاہر بہت محدود تھی ۔ مریض بھی کم ہی آتے ہوئے ۔ حقیقت یہ ہے کہ اوائل شباب ہی میں وہ عرق نوشی کے عادی ہو گئے تھے ۔ اس شغل میں

اتہاک کے باعث ان کے تمام کہالات ہر پردہ سا ہڑ گیا اور وہی صورت پیدا ہو گئی ، جس کا نقشہ میرزا غالب نے اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے یوں کھینچا ہے :

چوہرِ طبعم درخشان است ، لیک
روزم اندر ابر پنہاں می رود

مولانا سلیم مرحوم خود بھی بعض اوقات عالم سرور میں نہایت عمدہ علمی گفتگو کرتے ہوئے یکایک پیکر حسرت بن جاتے اور میرزا غالب کا یہ شعر پڑھتے :

یہ مسائلِ تصوف ، یہ تیرا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے ، جو نہ بادہ خوار ہوتا

ساتھ ہی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں ، لیکن میری اور بعض دوسرے نیاز مندوں کی انتہائی کوشش کے باوجود وہ عرق نوشی ترک کرنے پر آمادہ نہ ہوئے ۔ ان حالات میں خوش گوار تغیر کی کیا امید ہو سکتی تھی ؟

مولانا کے حالات بے حد دلچسپ بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی ، تاہم میں یہ داستان چھیڑ دوں تو اصل موضوع سے بہت دور چلا جاؤں گا ۔

یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ مولانا نے مجھے شرفِ تلمذ سے بھی نوازا ۔ میرا موجودہ تخلص بھی انہیں کا عطیہ ہے ، اگرچہ اس کی حیثیت مدت سے ایک تہمت کی سی رہ گئی ہے ،

سب سے بڑھ کر یہ کہ چند ہی روز کے بعد ”دیوان غالب“ پڑھنے کی تاکید فرمائی ، بلکہ چند غزلیں خود پڑھائیں، افسوس کہ میں کم علمی کے باعث ان کی تشریحات سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا۔ پھر مولانا حمزت موہانی اور شوکت میرٹھی کی شرحیں پڑھیں ، وہ بھی میرے لیے چندان سود مند ثابت نہ ہوئیں۔ لیکن شفیق استاد کے تاکیدی ارشاد کی تعمیل میں ”دیوان غالب“ کا مطالعہ برابر جاری رکھا۔ اگرچہ سوچنا ہوں تو آج بھی مجھ پر قطعاً واضح نہیں ہوتا کہ اس ارشاد کی بنیاد کیا تھی۔ رفتہ رفتہ طبیعت کو میرزا کے اسلوب بیان سے اک گونہ مناسبت پیدا ہونے لگی اور زیادہ تر اشعار کے معانی فہم کی دسترس میں آنے لگے۔

دسویں جماعت پاس کرنے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور میں پہنچا تو میرزا کے فارسی کلام سے روشناس ہوا۔ پھر بیدل کا مطالعہ شروع کر دیا ، صرف اس خیال سے کہ میرزا غالب نے ابتدا میں بیدل بہت پڑھا تھا۔ لیکن یہ دور جلد ختم ہو گیا :

در سلوک از ہر چہ پیش آمد گزشتن داشتہ
کعبہ دیدم ، نقشِ پایے رہرواں نامیدمش

میرزا ہی کی رہنمائی میں فارسی کے مشہور اساتذہ تک رسائی نصیب ہوئی ، جن میں سے بعض کا کلام عموماً پیری زبان پر

جاری رہتا ہے ۔

میرزا غالب کے ساتھ اولین روشناسی پر نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے ، تاہم آج بھی دل میں یہی آرزو موجزن رہتی ہے کہ گونا گوں مشاغل سے کچھ مہلت میسر آ جائے تو اسے میرزا کے فارسی اور اردو کلام یا اردو مکالمے کے مطالعے میں گزار دوں ، شاید اس طرح معنی رسی اور حقائق شناسی کی صلاحیت میں کسی قدر جلا پیدا ہو جائے ۔

الحمد للہ کہ میں اپنی فطری یا اکتسابی استعداد کے بارے میں غلط فہمی سے ہمیشہ محفوظ رہا ۔ قدرت نے جو کچھ عطا کیا تھا ، اس کی حیثیت قرآن حکیم کے لفظوں میں ”بضاعتہ مزجاء“ کی سی ہو گی ۔ باقی رہا تحصیل و اکتساب کا معاملہ تو میں ہر دور میں نارسائیوں ، ناسامدتوں اور واماندگیوں کا شکوہ سنا رہا ۔ تاہم میرے کشکول فکر و نظر میں جو بھی حقیر سی ہونجی موجود ہے ، اس میں شعر و ادب کی حد تک ہر شے کو میں اصلاً میرزا غالب ہی کا فیضان سمجھتا ہوں ، میرے ذوق ، میری صلاحیت فہم حقائق ، میری قوت اخذ معارف ، میرے معیار ”خوب“ و ”لا خوب“ نے میرزا ہی کے کلام کی آغوش محاسن میں تربیت پائی ۔ غرض میں جو کچھ بھی بن سکا ، اس کی بنیادیں میرزا ہی کی بارگاہ عظمت میں ہر خلوص عقیدت کی بدولت استوار ہوئیں ۔ اس کے لیے

اپنے شفیق و مکرم استاد مولانا حکیم محمد سلیم کے لیے نوافل
سحر کا ہی میں بالانتزام دعا کرتا ہوں ۔

میرزا کا یہ شعر بے شمار اصحاب نے پڑھا ہوگا ، بلکہ اسے
جا بجا استعمال بھی کیا ہوگا :

بک جانے میں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

میں لرو مایگی کے دلی اعتراف کے ساتھ اپنے تصور کے مطابق
اپنے آپ کو اس کی صداقت کی ایک شہادت سمجھتا ہوں ۔
اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ خدا بخواستہ میں اپنے عیارِ طبع
کے متعلق حسن ظن میں مبتلا ہوں یا میرزا غالب واقعی متاعِ
سخن کے ساتھ ہم نفس نفیس میرے پاس آ گئے ، حاشا وکلا ۔
صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے جو کچھ ملا ، میرزا
ہی کے سرچشمہ فیض سے ملا ۔ اگر آپ کی نظر میری بے حقیقتی
اور بے مایگی کی طرف جائے تو خواجہ شیراز کی حقیقت گوئی
نظر انداز نہ ہونی چاہیے :

ہر چہ بہت از قامتِ لاساز و بے اندام ماست
ورہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ لیست

اس سلسلے میں ایک بدیہی نقصان کی طرف بھی اشارہ کر دینا
ضروری ہے ۔ بالکل ابتدائی دور میں میرزا کے کلام سے شغف
پیدا ہو جانے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ میں اقبال کے سوا کسی

بھی اردو شاعر کا کلام آج تک بالاستیعاب نہ پڑھ سکا۔ مختلف شعرا کے دواوین صرف جستہ جستہ ہی دیکھ سکا۔ کیونکہ اقبال کو مستثنیٰ کرنے ہوئے غالب کی آتش سیال کا سا کیف و سرور کسی دوسرے ختم خانے میں نہ مل سکا۔

اگرچہ یہ ذکر پیش نظر موضوع سے بے تعلق ہے، تاہم میرے لیے ایسی ہی صورت اردو نثر میں بھی پیش آتی۔ میں نے بالکل ابتدائی دور میں ”الہلال“ پڑھا اور شعر سے نثر کی طرف توجہ ”الہلال“ ہی کے باعث منعطف ہوئی۔ مولانا ابوالکلام مرحوم کے انداز بیان نے ذہن و دماغ پر اس طرح قبضہ کر لیا کہ میں اردو نثر کے بھی بیشتر عمدہ ذخیروں سے جزواً ہی مستفید ہو سکا۔

میری مثال کوئی اچھی اور قابلِ تقلید مثال تو یقیناً نہیں، مگر یہ ضرور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر ذوق صحیح کے نشو و ارتقا کی آرزو ہو، اگر حقائق و معارف عالیہ سے حقیقتاً لذت یاب ہونے یا الہیں دل پذیر طریق پر پیش کرنے کی صلاحیتوں میں فروغ و بالیدگی کی جستجو ہو تو میرزا کا کلام ضرور پڑھیے، نظم بھی اور نثر بھی۔ اس طرح پڑھیے جو پڑھنے کا حق ہے۔ اس عاجزانہ گزارش کو شرف قبول بخش کر آپ یقیناً ہشیان نہ ہوں گے۔ میرزا کا یہ ارشاد شاعرانہ تعلیٰ کا

کرشمہ نہیں ، حقیقت کا ترجمان ہے :

دورِ تم پر حرفِ غالب ، چیدہ ام میخانہ
تازِ دیوانم کہ سرمستِ سخن خواهد شد

اہلِ ذوق کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ غالب کو ”ذاتی تاثرات کے آئینے“ میں دیکھیں اور بتائیں کہ انہیں وہاں کیا نظر آتا اور کیا کچھ محسوس ہوتا ہے ؟ یہ بات جتنی آسان ہے اتنی ہی دشوار بھی ہے ۔ اپنے وارداتِ قلب کا بیان کسی وقت تو بلا دقت سامنے آجاتا ہے لیکن کسی وقت اپنے قلب کی کھراٹیوں میں غوطہ زن ہونا پڑتا ہے جب کہیں جا کر یہ چھپا ہوا موق برآمد ہوتا ہے ۔

اردو ادب پر غالب کا اتنا رعب اور اثر ہے کہ نقاد و غیر نقاد دونوں طرح کے اصحاب اُس کی غزلیں سننے سنانے میں جا بجا واہ وا اور سبحان اللہ کہنے پر مجبور بھی ہوتے ہیں اور اُن سے لطف بھی اٹھاتے ہیں ۔ یہ تنقید نہیں تمسین ہے یہ دل کا تحفہ ہے دماغ کے لیے ! اسی بنا پر غالب کی بابت اقبال نے خوب کہا ہے :

”زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا“ !

غالب کی ”مشکلیں“ اور ”آسائیاں“ اُس کے سارے دیوان

میں بکھری پڑی ہیں - ”مشکلوں“ کی بابت تو خود غالب نے کہہ دیا ”گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل“ - اور ”آسانیوں“ کی یہ کیفیت ہے کہ جیسی آسان و رواں غالب کی بعض غزلیں ہیں شاید کسی اور بڑے شاعر کی نہیں - اس وقت غالب کی بیسیوں دل پذیر غزلیں سامنے آرہی ہیں، بیسیوں اشعار زبان پر آرہے ہیں - اگر کتبچاںش ہوتی تو یہاں آن سب کو پیش کر دیا جاتا اور ہزاروں بار آن سے لطف آٹھایا جاتا لیکن یہاں اس انتخاب کا موقع و محل نہیں - پھر بھی کچھ سن لیجئے گو جو کچھ آپ خوب جانتے ہیں میں وہی دہرانے لگا ہوں :

دلِ نادان تجھے ہوا کیا ہے ؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے ؟

درد منت کثر دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

دائم بڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی یہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ انہاں ہو گئیں

لکنہ جیسے ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ اپنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ اپنے

بازچہ اطفال ہے دلہا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تملشا مرے آگے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

مدت ہوئی ہے یار کو مہاں کسے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کسے ہوئے

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

ایک زمانے میں مجھے غالب پر یہ اعتراض تھا کہ وہ
بادہ خوار تھا۔ لیکن یہ شعر بار بار پڑھ کر مجھ سا خشک مزاج
ابھی سوچ میں پڑ گیا :

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

اس بے خودی میں غالب نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ
ہمارے لیے اپنے کلام میں مناظرِ قدرت اور تصوف اور صبر و
ہمت اور انسانی فطرت کے کئی اور موضوعات پر ایسی لاجواب

چیزیں جھوڑیں کہ، اُن سے بہارا گرتا ہوا معاشرہ بھی کچھ
 سنبھل گیا اور محاکات کا یہ حال ہے کہ، ہر فرد نے بھی اپنی
 جگہ محسوس کیا کہ ”میں نے یہ جانا کہ، گویا یہ بھی میرے
 دل میں ہے“ !

بعض زبردست نقاد یہ کہتے سنئے گئے ہیں کہ غالب کا
 کلام قنوطیت سے بھرا ہوا ہے اور اس کے ثبوت میں یہ شعر
 بھی پڑھا گیا ہے :

رات دن گردش میں ہیں سات آہاں
 ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گہرائیں کیا !

ذاتی طور پر میر سمجھتا ہوں کہ میں نے اس شعر سے حوصلہ افزائی
 اور خوش آمدی کی دولت پائی ہے ۔ غالب جہاں غم کا بھی
 ذکر کرتا ہے تو اُس سے وہ ایک راست باز دل کو حوصلے کا
 سبق دیتا ہے :

غم اگرچہ جان گسل ہے یہ کہاں بھیں کہ دل ہے
 غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

مطلب یہ ہے کہ غم سے گریز کرنا غم کا علاج نہیں ۔
 غم تو زندگی کے لیے ضروری ہے ۔ غم نہ ہو تو خوشی
 بے معنی ہو کر رہ جائے جیسے رات کی تاریکی اور عزت نہ ہو
 تو دن کی روشنی اور رونق سب ختم ہو جائے ۔ یہ حقیقت یوں
 ہے راست یا غم پسندی نہیں ۔ ایک صحیح قسم کے مفکر یا

مومن کے لیے غم دل کی تقویت کا باعث بنتا ہے ۔ غالب ہزار
دفتوں میں گھر کر بھی مسلسل کوشش کا علم بردار ہے :

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہمِ نخس آئیاں کے لیے

غالب آمائیاں نہیں ڈھونڈتا وہ مشکاوں کو آسان کرنے کے
در پے رہتا ہے :

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں آسان ہونا

وہ نا آمیدی کو لٹکارتا ہے :

بس ہجومِ نا آمیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذتِ ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

وہ بد کہہ کر ہمیں ہمت پر آکساتا ہے :

توقیقِ باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں وہ قطرہ ہے کہ گوہر نہ ہوا تھا

دردِ زندگی کی آس نے کیسی لاجواب دوا تجویز کی ہے ۔
اس شعر کو سنئے جو مجھ سے ہزاروں نے سینکڑوں بار دہرایا
اور گن گنایا ہوگا اور دیکھیے کہ اقبال کے آنے سے کم از کم

نصف صدی پہلے غالب نے عشق کے تصور کو کس طرح پاک و صاف کر دیا تھا :

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا ہائی درد بے دوا پایا !

وہی غم میں صبر و ہمت کی تلاش اور کسی کے راہِ گین تصور میں بے خودی و انہماک کا سبق - اور سنیے زندگی اور حقیقت شناسی پر کیسا لاجواب تملی یغلی متصوفانہ فیصلہ ہے لفظی و معنوی دونوں لحاظ سے خوبصورت اور حوصلہ پرور :

محرّم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے ہر وہ ہے ساز کا

حقیقت کی تلاش کاوش کا سبب کیوں بنے ؟ خدا کو جا بجا کیوں ڈھونڈتے پھرے وہ تو ہمارے دل ہی میں موجود ہے اور جو حجاب سا محسوس ہوتا ہے اُس کے اندر مطلوب کا جلوہ ہے - حجاب اٹھا دیجیے ، قصہ ختم !
لیکی ہدی کے مسئلے پر خوب کہا ہے :

لطافت بے کثافات جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زلکار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

کثرتِ ایمان کو کیسے وحدت کا سادہ حل بتا دیا ہے :

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایمان ہو گئیں

اور شیخ و برہمن کے سب جھگڑے یوں طے کر دیے :

وفاداری بشرط استواری عین ایمان سے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

خدا کی بے نیازی پر کیسی نیاز مندانہ تنقید ہے :

زندگی اپنی جو اس شکل کے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں آگے کہ خدا رکھتے تھے !

اور

”کیا وہ ہنرود کی خدائی تھی ؟

ہندگی میں مرا بھلا نہ ہوا“

ملائیٹ پر ایک اسی طرح کی اور چوٹ ہے جو خدا بھائی کی
طرف ایک لیا اقدام بھی ہے :

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

ہلکہ طور سے بھی آگے :

ہے ہرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے غالب غم میں آسید کا اور

مشکلات میں ہمت کا اور اپنے فلسفے میں صحیح قسم کی

معرفت کا پیغام دیتا ہے ۔ یہ ہے وہ چیز جو میں نے غالب سے

پائی ہے ۔ بیک وقت زبان کی روانی ہے اور خیالات کی بلندی

جو دل میں جگہ پا لیتی ہے ! ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے
غالب کے کئی سنجیدہ شعروں میں بھی ہلکی پھلکی ظرائف یا
طنز ہوتے ہیں جو بہت ہر لطف ہے ۔

ایک دفعہ سر اس مسعود اور میں اکٹھے بیٹھے غالب
پر باتیں کر رہے تھے کہ ہم دونوں نے کہا کہ آؤ مل کر
غالب کا بہترین شعر چنیں جو ہمیں پسند ہو ۔ ہم دونوں کا
خیال ان دو شعروں کی طرف گیا جو ایک لحاظ سے فی الحقیقت
ایک ہی شعر ہیں ۔ ہم نے کہا اس یہ غالب کے بہترین شعر
ہیں ۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی دماغ کا فیصلہ نہ تھا بلکہ دل
کا فیصلہ تھا ۔ یہاں تنقید نے کام نہ کیا بلکہ جذبہ احساس اور
اشتیاق حسن نے :

نہیں نکار کو آفت نہ ہو نکار تو ہے
روانی' روش و مستی' ادا کہے !

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبی' ہوا کہے !

اکثر لوگ آپس بھرتے ہیں کہ ہم تو محبوب پر مرتے ہیں
لیکن وہ ہم سے بے پروا ہے ۔ اکثر لوگ اس بات کے بھی
شاک ہیں کہ ہائے بہار کتنی جلد ختم ہو جانے والی شے ہے ۔
غالب کا حقیقت میں حساس دل اس کے برعکس نکار کے حسن
کو دیکھتا ہے اور دیکھتا ہی رہتا ہے اور اکثر اس سے آگے

قدم اٹھانا ضروری نہیں سمجھتا اور نہ وہ بہار کو دیکھ کر اس خیال سے آہیں بھرتا ہے کہ ہائے وہ توجہت جلد ختم ہو جائے گی۔ اپنے بہترین کلام میں وہ ماضی و حال اور مستقبل سب میں عموماً حال پر نظر رکھتے ہوئے اس سے لطف اندوز ہونا کافی سمجھتا ہے۔ کتنا بلند خیال، کیسی پاکیزگی، کیسا قرغم کیسا ضبط اور کیسی بے غرضانہ محبت ہے۔ یہ ہے حقیقت میں جذب ہو جانا اور بھر آئے اپنے میں جذب کر لینا !

یہ ہے وہ خزانہ جو میں نے غالب میں پایا ہے۔ یہ ہے دین و دنیا کی زندگی کا نچوڑ۔ اس میں تنقید کو کم دخل ہے۔ اس پر اقبال کا یہ شعر یاد آتا ہے :

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

غالب کے سارے دیوان کے ہال کی کھال نہ اٹار لیے۔
بس اس پر کبھی کبھی نظر ڈالیں اور اسی نظر میں محو ہو جائیں۔

ڈاکٹر محمد وحید مرزا

غالب کا شمار آج کل اردو کے بہترین شعراء میں ہوتا ہے ، بلکہ بہت سے لوگوں کی رائے میں الہیں اولیت کا شرف حاصل ہے، لیکن غالب کی اس عام شہرت اور مقبولیت کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ، کیونکہ اس کا آغاز تقریباً بیسویں صدی کے دوسرے دس سالوں ، یعنی ۱۹۱۲-۱۹۱۳ء کے قریب ہوا اور شروع میں چند نوجوان ادیبوں نے جن میں عبدالرحمان چنوری پیش پیش تھے ، غالب کی عظمت کا اندازہ کیا اور ان کے کلام کی گونا گون خوبیوں کو منظر عام پر لانے کی سعی کی ، چنانچہ ان کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں شعر و سخن کا ذوق رکھنے والے لوگ غالب کی بزرگی کا دم بھرنے لگے اور ان کے کلام کی طرف پیش از پیش توجہ شروع ہو گئی ۔ غالب کے کلام سے میرا اپنا تعارف صحیح معنوں میں ۱۹۱۶-۱۹۱۸ء میں ہوا ۔ میں اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور میں انٹرمیڈیٹ کے دوسرے سال میں پڑھ رہا تھا ۔ ہمارے گھر میں مولانا حسرت موہانی کی لکھی ہوئی دیوان غالب کی شرح کا ایک نسخہ

کہیں سے آ گیا تھا ، اسے پڑھنے کا شوق ہوا اور اس کے مطالعے میں اس قدر لطف محسوس ہوا اور اتنی دل چسپی بڑھی کہ اردو کے دوسرے شعراء کا کلام پھیکا اور بے مزہ معلوم ہونے لگا ، چنانچہ غالب کی زیادہ تر معروف غزلیں زبانی یاد ہو گئیں اور ان میں سے بہت سی ابھی تک یاد ہیں ۔ اتفاق سے اسی زمانے میں ہمارے کالج کے پروفیسر شیخ نور الہی صاحب نے ، جو کالج کی ادبی اور ثقافتی زندگی میں ہمیشہ بہت دل چسپی لیتے تھے ، کالج کے طلبہ کو غالب کے کلام پر ایک مبسوط مقالہ لکھنے کی دعوت دی اور بہترین مقالے پر انعام دینے کا وعدہ فرمایا ۔ میرے منجھلے بھائی خورشید نے ، جو اس وقت تک ایم ۔ اے کر چکے تھے اور جنہیں انگریزی ، فارسی اور اردو شاعری سے خاص شغف تھا بلکہ ان تینوں زبانوں میں خود بھی اچھے شعر کہہ لیتے تھے ، مجھے کہا کہ میں بھی اس مقابلے میں شریک ہوں ۔ مجھے اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا احساس تھا اور یہ خیال تھا کہ میرا مقابلہ بعض ایسے طلبہ سے ہوگا جو مجھ سے سینیر تھے اور زیادہ قابل تھے اور اس لیے میری کاسیابی کے امکانات بہت کم رہ جائیں گے ، لیکن ان کی ترغیب و تحریص سے میں نے کمر ہمت باندھی اور اللہ کا نام لے کر مضمون لکھنا شروع کر دیا ۔ اس کی تیاری میں وہ برابر میری مدد کرتے رہے اور مفید مشورے دیتے رہے ۔ آخر مقالہ تیار ہو گیا اور میں

نے اسے پروفیسر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ چند روز بعد نتیجے کا اعلان ہوا اور میری توقع کے بالکل بر خلاف انعام مجھے ہی ملا۔ انعام کی رقم زیادہ بڑی نہ تھی لیکن مجھے جو خوشی اس کامیابی سے ہوئی وہ ابھی تک یاد ہے اور اس روپے سے جو کتاب میں نے خریدی تھی وہ بھی تا حال میرے پاس محفوظ ہے اور زمانہ رفتہ کی ان یادگاریوں میں سے ایک ہے جو مجھے بہت عزیز ہیں۔

غالب کی مقبولیت کا راز کیا ہے؟ اس کے بارے میں یہاں کسی تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ گذشتہ تیس چالیس سال کے عرصے میں غالب پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ کسی اور اردو شاعر کے بارے میں نہیں لکھا گیا، اور اگرچہ زمانہ حال میں بعض اور شعراء، مثلاً میر تقی میر، مومن، سودا، ایس وغیرہ کے کلام کی جانب بھی بہت توجہ کی گئی ہے لیکن کسی اور شاعر کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر اتنی سیر حاصل بحث نہیں کی گئی۔ اس معاملے میں اگر کوئی غالب کا مقابلہ کر سکتا ہے تو وہ اقبال ہیں جو خود غالب کے مداح اور ان کی عظمت کے معترف تھے۔ لہذا اس مختصر مضمون میں صرف ان چند تاثرات کا ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا جو مجھے غالب کے مطالعے سے حاصل ہوئے۔ سب سے پہلی چیز جس نے مجھے متاثر کیا وہ غالب کی جدت

پسندی اور غزل کی قدیم روش سے ان کی بغاوت ہے ۔ یہ بات ان کے اسلوبِ تحریر میں اتنی ہی نمایاں ہے جتنی کہ ان کے خیالات میں ، فارسی ترکیبوں کا استعمال اس طرح کہ وہ اردو میں غیر مانوس اور بے ربط نہ معلوم ہوں بلکہ ان کی وجہ سے ایک خاص قسم کی عبارت کی روانی ، بندش کی چستی اور اسلوب کی پختگی پیدا ہو جائے ، ان کے کلام کی ایک نمایاں خصوصیت ہے ۔ اس سے اردو شاعری میں ایک نئی کیفیت اور تازگی پیدا ہو گئی ۔ اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے بعض اشعار میں فارسی ترکیبوں کا استعمال حد اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے جس کی وجہ سے ایک طرح کی ثقالت اور تعقید پیدا ہو گئی ہے ، مثلاً ان کے اس شعر میں کہ :

شمارِ سجدہ مرغوبِ بت شکلِ پسند آہا
نماشایِ بیک کفِ بردنِ صددلِ پسند آہا

لیکن ایسے اشعار غالب کے دیوان میں گنتی کے ہیں اور وہ بھی ان کی مشقِ سخن کے ابتدائی دور کے ۔ اس کے برخلاف زیادہ تر اشعار میں اردو اور فارسی کا امتزاج ایک مناسب حد کے اندر ہے اور بہت خوش آئند ہے ، اور مجھے ان کا یہ دعویٰ کہ :

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بہاں اور

بالکل صحیح معلوم ہوا۔ ان کی شاعری کی ایک اور خصوصیت جس نے مجھے یحسد متاثر کیا ان کی دعوتِ عمل ہے اگرچہ بعض اوقات عالم یاس میں وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ :

مری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورتِ خرابی کی
ہیولی برقِ خرمن کا ہے خونِ گرمِ دہقان کا

یا انسان کی مجبوری اور بے بسی کو دیکھ کر ان کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ :

کوئی امید بر نہیں آئی
کوئی صورت نظر نہیں آئی

لیکن وہ انسان کی سعی اور کوشش کو بیکار نہیں سمجھتے بلکہ لاکسی میں بھی ایک لذت محسوس کرتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں کہ :

بس ہجومِ نا امیدِ خاک میں مل جانے کی
یہ جواک لذتِ بہاری سعیِ لاحاصل میں ہے

اور انسان کو سرگرم عمل رہنے کی ترغیب یوں دیتے ہیں کہ :

رگوں میں دوڑتے بھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے

پھر ان کی نظر میں انسان کی جو قدر و منزلت اس کائنات کے اندر ہے اس کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ :

رکھتے ہو تم قدم میری آنکھوں سے کیوں دریغ
رکتے ہیں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

اور اسی خیال کو تغزل کے رنگ میں یوں پیش کرتے ہیں کہ :

عاشق ہوں یہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنون کو برا کہتی ہے لہالی مراے آگے

گویا دوسرے الفاظ میں وہ انسان کو احساس خودی و عزت نفس کا درس دیتے ہیں ۔ یہ بات ان کی شاعری کی ان خصوصیات میں سے ہے جنہوں نے مجھے اس زمانے میں خاص طور پر متاثر کیا ۔

دلہا کی بے حقیقی اور لذات دنیوی کی بے ثباتی کا ذکر ہمارے سب ہی شاعر کرتے چلے آئے تھے ، غالب بھی وجود باری تعالیٰ کو ایک تنہا حقیقت سمجھتے تھے اور خدا کی وحدانیت مطلقی کے قائل تھے ، چنانچہ کہتے ہیں کہ :

اے کون دیکھ سکتا کہ ہنگامہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوجار ہوتا

لیکن وہ مظاہر دنیوی کو بھی بے حقیقت اور سراب محض نہیں سمجھتے :

جب کہ تجھ ان نہیں کوئی موجود
بھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کہے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

لالہ و گل کہاں سے آنے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

گویا ان کے نزدیک ہمارے گرد و پیش جو چیزیں ہیں
انہیں محض ہیکار اور بے حقیقت سمجھنا شرط ہے۔ ان کے اس
انقطہ نظر سے میری طرح ہر انسان ضرور متاثر ہوا ہوگا۔

اردو شاعری میں عشقیہ اشعار کی بھرمار ہے بلکہ ہمارے
کلاسیکی شعراء کے کلام میں اکثریت اسی نوعیت کے اشعار
کی ہے، غالب کا کلام بھی اس چیز سے خالی نہیں، لیکن
عشق و محبت کے جذبات اور واردات قلبی کے بیان میں بھی
جو شگفتگی اور جاذبیت غالب کے کلام میں ہائی جاتی ہے
اس کی مثال کسی دوسرے اردو شاعر کے کلام میں بہ مشکل
ہی ملے گی، مثلاً ان کی اس غزل :

مدت ہوئی ہے ہار کو سماں کہے ہوئے
جوش قلع سے بزم چراغاں کہے ہوئے
دل ڈھونڈتا ہے بھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصور جانان کہے ہوئے

مانگے ہے بھر کسی کو لب ہام پر ہوس
زلف سیاہ رخ بہ ہریشان کیے ہوئے

چاہے ہے بھر کسی کو مقابل میں آرزو
سرے سے تیز دشنہ' مڑگان کیے ہوئے

کا ہر شعر ایسا ہے کہ جو ایک خاص کیفیت اور اثر میں ڈوبا ہوا ہے اور ہر انسان، خصوصاً ہر لوجوان، کے دل پر ایک ایسا گہرا نقش چھوڑتا ہے جو کبھی محو نہیں ہو سکتا آخر میں غالب کی وہ خصوصیت جس نے مجھے بے انتہا متاثر کیا یہ ہے کہ ”پابستگی رسم ورہ عام“ کرتے ہوئے ، یعنی ”ظرف تنگنائے غزل“ ہی کو ذریعہ اظہار خیالات بنا کر ، انہوں نے اپنے ڈیڑھ دو جزہ کے مختصر سے دیوان میں مضامین کی اتنی وسعت ، اتنا تنوع اور اس قدر ہمہ گیری پیدا کر دی ہے جو یقناً حیرت انگیز ہے اور ان کے اس دعوے کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں کہ اسی مختصر سے دیوان کے بل پر انہوں نے ریختہ کو فارسی بنا دیا ہے ۔ فلسفیانہ اور متصوفانہ مضامین کے علاوہ ، قلب انسانی کی مختلف کیفیات ، حسرت و یاس ، رنج و الم ، راحت و سکون ، امید و بیم ، غرض یہ کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو یا گوشہ ایسا نہیں ہے کہ جس کے بارے میں کوئی نہ کوئی شعر اس دیوان میں نہ مل سکے۔ کم از کم میں اپنے بارے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اردو

شاعری کی عظمت کا احساس اور اس کا صحیح ذوق مجھے
 بہت حد تک غالب کے کلام کے مطالعے ہی کی بدولت حاصل
 ہوا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری سے متعلق جن
 دو کتابوں نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ دیوان غالب
 اور مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات تھی۔

علی عباس حسینی

کردار اور سیرت کے بننے کا زمانہ یقینی طور پر عہدِ طفولیت ہوتا ہے ۔ ہمارے والدین ہمیں جس طرح کی تربیت دیتے ہیں ، ہم جس طرح کے ماحول میں پلتے اور بڑھتے ہیں ، ہمارے گرد و پیش اعزاء اور ہمسائے جس طرح کی زندگیاں بسر کرتے ہیں ، ہمیں درس میں جو کتابیں پڑھانی جاتی ہیں ، ہمارے معلمین جس مزاج اور طبیعت کے ہوتے ہیں اور جس ڈھنگ کا سلوک وہ ہم سے روا رکھتے ہیں ، ان سب سے ہم اثرات قبول کرتے ہیں اور یہی ہماری سیرت کی نشو و نما کی بنیادیں ہوتی ہیں ۔ میں سولویوں کے گھرانے میں پیدا ہوا ، مگر خدا کا شکر ہے کہ بزرگ بالکل قل اعوذئے نہ تھے ۔ اس لیے گو ابتدا میں فارسی اور عربی کی تعلیم دی گئی مگر انگریزی کی طرف میرا رجحان دیکھ کر کسی نے انگریزی اسکول میں داخلے کی مخالفت نہ کی ۔ میری سیرت کو اگر کسی کتاب نے متاثر کیا تو وہ سعدی کی گلستاں تھی اور فقہ میں جامع عباسی اور میرے ذوق ادب و زبان کی اگر کسی صنف سخن نے آبیاری کی تو وہ مرثی اکیس و نفیس و وحید

تھے۔ غزل گو شعرائے اردو سے میں اسکول میں پہنچ کر متعارف ہوا۔ مگر یہ واقفیت بہت ہی محدود تھی۔ مٹریکولیشن تک کورس میں چند منتخب شعرا کی چند منتخب غزلیں قویں۔ میرے زمانے میں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو ادب کی تعلیم کارواج نہ تھا۔

لیکن خوش قسمتی سے ایف۔ اے اور بی۔ اے کی تعلیم کے لیے لکھنؤ جیسے مرکز شعرو سخن میں آنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شعرو شاعری کا ہر جگہ چرچا رہا کرتا تھا۔ ہر ہفتے کسی نہ کسی انجمن کی طرف سے ایک مشاعرہ ضرور ہوتا اور سال میں دو تین بڑے بڑے مشاعرے جن میں دور دور سے نامور اور مشہور شعرا شرکت کے لیے تشریف لاتے تھے۔ غرض ان مشاعروں میں شرکت، یہاں کے ممتاز شعرا کی خدمت میں ہارباہی کے شرف، زبان سیکھنے کے شوق اور اپنے ہاں کے شعرا کے کلام میں تفکر اور جدت کی تلاش نے میری غالب لک رسائی کرائی۔ اور وہ جس کا تجسس تھا اور جس کی تلاش تھی، یعنی تفکر، تنوع، بلند پروازی، جدت طرازی، مرصع کاری، حسن بیان، وقعت حوصلہ، خود داری، معراج تخیل کے ساتھ ساتھ شوخی، طنز، بانگین اور انداز بیان میں نیا پن، یہ ساری خوبیاں اس ایک اکیلے کے کلام میں مل گئیں۔ پھر تو غالب کو اتنا پڑھا، اتنا پڑھا کہ

تقریباً پورا دیوان حفظ ہو گیا۔ اور موقع موقع سے اس کے اشعار زبان پر آنے لگے۔ اور اب محسوس ہونے لگا جیسے اس نے اپنے اشعار میں ان جذبات و حسیات کو بیان کر دیا ہے، جو میرے دل کی تہوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ بقول اسی کے دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس لیے اس کے اشعار کے ہر محل استعمال نے بعض وقت لطائف جیسا مزہ دیا۔ کچھ واقعات آپ کے ناظرین کے نفس طبع کے لیے حاضر ہیں۔

۱۔ بہار کے ایک جلیل القدر بزرگ، واسرائے کے ایکزیکٹیو کانسل کے ممبر مقرر ہوئے۔ اور محکمہ اطلاعات ان کے سپرد ہوا۔ مجھے ان کی خدمت میں نیاز حاصل تھا اور ان کے بہتچے اور مہینی صاحبزادے کی وساطت سے قربت کا شرف بھی۔ ایک دوست نے اصرار کیا کہ ان کے لیے محکمہ کی ایک اچھی اسامی کے لیے سفارش کر دوں۔ چنانچہ میں نے حاضر خدمت ہو کر پرزور وکالت کی اور ان سے وعدہ لے لیا کہ وہ میرے دوست کی درخواست پر یہ ہمدردی شور فرمائیں گے۔ جب میں خوش خوش سلام کرتے کمرے سے باہر نکلنے لگا تو ان کے صاحبزادے نے قربت کے جوش میں آ کر مجھ پر خفگی

کا اظہار کیا کہ ”ہونہ! دوسروں کی سفارش کے لیے دوڑے چلے آئے اپنے لیے نہیں کہا گیا۔ اس جگہ کے لیے تو تم ان صاحبزادے سے کہیں زیادہ موزوں ہو۔“ چونکہ یہ ڈانٹ اتنے زور سے بتائی گئی تھی کہ ان کے والد محترم نے بھی سن لی تھی اس لیے میں سٹ پٹاسا گیا۔ لیکن غالب نے بر محل رہنمائی کی۔ میں نے عرض کیا۔

کہتے ہوئے ساق سے کہا آتی ہے ورنہ
ہے ہوں کہ مجھے درد تہہ جام بہت ہے ؟

اس پر خفا ہونے والے عزیز تو سر کھجائے لکھے مگر بزرگ محترم کی آنکھوں میں خوشنودی کی ایک جھلک دکھائی دی اور انہوں نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ اور میں کمرے سے نکل کر غالب کا ایک اور شعر گنگنائی گھر چلا آیا۔

اپنی ہستی ہی سے ہوا جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

۲۔ (الف) بارہ برس میں نے جوبلی کالج لکھنؤ میں معلم کے فرائض پسر کیے۔ علامہ اختر علی تلمبہری اور خواجہ اطہر حسین فلسفی جیسے افاضل مخلصین میں تھے۔ ہم کینوں اکثر ملی و مذہبی مسائل پر سر فراز اخبار

میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ موضوع اکثر ویسے تو توہیات ہوئے تھے جو مذہبی مراسم میں داخل ہو گئے ہیں اور جو عقلی حیثیت سے نہ درست ہیں اور نہ ملت کے لیے سود مند۔ ظاہر ہے کہ خوش عقیدہ لوگوں کو ہماری یہ حرکت حد درجہ ناگوار گزرتی تھی۔ ایک نوجوان تعائد دار تو اس درجہ برہم تھے کہ وہ ہمیں ہمیشہ ملحدین جوہلی کالج کے خطاب سے یاد کیا کرتے تھے۔ بعض مذہب پرست خفا ہو کر ان مضامین کا جواب لکھتے اور سب و شتم سے کام لینے میں بھی نہ چوکتے۔ یہ باتیں علامہ ظہری کو جو خود بھی عربی کے فاضل تھے اور علم کلام پر نظر غائر رکھتے تھے، غصہ دلا دیتی تھیں اور ان کے ظہری خون کی حرارت ان کی متانت پر غالب آ جاتی تھی، تو ہم انہیں تلخ نوائی سے باز رکھنے کے لیے ہمیشہ کہتے۔

گرمی سہی کلام میں لپکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

(ب) اسی زمانے میں میرے ایک ہم وطن نے ایک واعظ کا اسم گرامی لے کر فرمایا کہ وہ تم لوگوں کو حد درجہ برا بھلا کہہ رہے تھے۔ بلکہ انہوں نے یہاں تک فرمایا کہ "شاہی نہ ہونی ورنہ ان لوگوں کی زبان

گدی سے کھنچوالی جاتی!“ - میں نے بے ساختہ غالب کا یہ شعر پڑھ دیا -

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

وہ بھی صاحب ذوق تھے، بر عمل شعر پر بھڑک اٹھے، بات کا رخ ہلٹ گیا اور غالب کے کلام کے علان پر گفتگو ہونے لگی -

(ج) اسی زمانے میں ایک مولوی پرست بزرگ سے ایک مسئلہ کے متعلق گفتگو کے سلسلے میں میں نے انہیں ایک شرعی نکتہ کی طرف توجہ دلائی - وہ تعجب سے بولے ”اچھا، تو تم کو باوجود انگریزی دان ہونے کے، اس شرعی حکم کا بھی علم ہے!“ -

میں نے عرض کیا ”قبلہ میں بھی اسی حوض کا کپڑہ ہوں جس میں آپ غوطہ و طہارت فرماتے رہتے ہیں“ اور بے ساختہ غالب کا یہ شعر زبان پر آ گیا -

گو واں نہیں، بہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

۴ - کوئی پانچ سال قبل کا واقعہ ہے کہ ایک وزیر صوبہ کی خدمت میں ایک انجمن کے کالم سے جس کے وہ صدر اور میں سکریٹری تھا، حاضر ہوا - اس وقت وہاں کچھ اور وزرا بھی بیٹھے ہوئے تھے - اس لمحے ”سکیورٹی“ کے

سباہیوں نے ، جو مجھے پہچانتے نہ تھے ، ہنسنے کے اندر
جانے سے روک دیا مجھے ناگوار سا کزرا اس لیے میں نے اپنا
رکشا فوراً مڑوا لیا مگر چلتے وقت اپنے کارڈ کی پشت پر عرفی
کا یہ مطلع لکھا :

از در دوست چہ گویم بہ چہ عنوان رقم
ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرمان رقم

اور سباہی کو کارڈ دیکر کہا ”اے صاحب کے ہاں اندر
بہجوا دینا“ ۔ اور گھر چلا آیا ۔

دوسرے دن جب وزیر موصوف سے ملاقات ہوئی تو
انہوں نے کہا ”تم فوراً کیوں چلے گئے ؟ اندر آ کر پی ۔ اے
کے پاس بیٹھ جاؤ ، وہ لوگ تو دس منٹ بعد ہی چلے گئے
تھے“ ۔

میں نے عرض کیا :

دل ہی تو ہے سیاستِ درہاں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیسے !

وہ بھی صاحب ذوق تھے ۔ بڑی دیر تک اس شعر کو
پڑھتے اور جھومتے رہے ۔

میں نے کہا ”گستاخی ضرور ہے ، مگر اسی کا ایک

اور شعر جو میرے حسب حال ہے وہ بھی سن لیجیے“

انہوں نے فرمایا ”ضرور ، ضرور سناؤ ۔ کیا کہا ہے اس

ظالم نے ۹

میں نے عرض کیا ۔

بندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہی ہیں کہ ہم
اٹنے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

فرمایا ” واقعہ سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب کے شعر کی
کن الفاظ میں داد دوں اور تم سے جو سپاہی نے گستاخی کی
اس کی معافی کن الفاظ میں مانگوں “ ۔

میں نے عرض کیا ” میرا ذکر چھوڑیے ، بس شعر سے
نطف لیجیے “ ۔ اور وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے ۔

۴ ۔ جوبلی کالج لکھنؤ میں بارہ برس متعلیمی کے فرائض ادا
کرنے کے بعد میرا تبادلہ کانپور کر دیا گیا ۔ ایک مہربان
حاکم بالا دست کی خدمت میں اس تبادلے کی منسوخی کی
غرض سے حاضر ہوا ۔ ان کرم فرماتے فرمایا کہ
” ایک کالج میں مسلسل بارہ برس رہ چکے ، یہ سرکاری
قانون کے خلاف ہے ۔ لکھنؤ کے علاوہ جہاں کہو
بھیج دوں “ ۔

میں نے عرض کیا ۔

” جب میکہ چھٹا ہے تو پھر کیا جگہ کی قید
مسجد ہو ، مدرسہ ہو ، کوئی خانقاہ ہو ! “

کو میں محروم ہلتا لیکن غالب کے شعر نے مجھ میں ایک

طرح کی توانائی پیدا کر دی ۔

۵ ۔ سال پیوستہ میرا منجھلا لڑکا اپنی دلہن کو لیکر امریکہ سے آیا ۔ ۶ دسمبر کی صبح کو امریکی دلہن ہندوستانی مراسم کے ساتھ ہندوستانی لباس میں گھر میں اتاری گئی ۔ ۷ دسمبر کی صبح آئی تو بڑی آرزوؤں اور تمنائوں کے بعد ، بڑی جہو کے ہاں اسپتال میں بھی پیدا ہوئی مگر مری ہوئی ، ماری خوشیوں پر پانی بہہ گیا ۔ گھر بچائے مسرت خانہ کے عزا خانہ بن گیا ۔ احباب و اعزا جو مبارک باد دینے آئے تھے تعزیت کے فرائض ادا کرنے لگے ۔ مجھ سے جس سے بھی گفتگو ہوئی میں نے غالب ہی کا یہ شعر پڑھا ۔

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی !

۶ ۔ میں نے اپنا وطن ترک کر کے لکھنؤ کا ایام اختار کیا ہے ۔ ایک تو اس لیے کہ عمر کے ۷۲ برسوں میں ۶۲ سال شہر میں گزارے ہیں اور ان کے بھی تقریباً باون برس صرف لکھنؤ میں ۔ اس لیے دیہات کی زندگی بسر کرنا ، اور وہ بھی خاتمہ زمینداری کے بعد بہت دشوار ہے ۔ دوسرے ارباب وطن کا سلوک بھی غالب کے اس شعر کا مصداق ثابت ہوا ۔

کہوں کیا خوبیؔ اوضاعِ اپنائے زماں غالب
ہدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

اس لیے عجب نہیں کہ مرے وقت اسی نابغہ کا یہ شعر
زبان پر جاری رہے -

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لے مرے خدا نے مری یہ کسی کی شرم!

جسٹس ایس - اے رحمت

میری طالب علمی کا زمانہ تھا - بھوپال سے شائع شدہ دیوانِ غالب کے نسخہٴ حمیدیت کا بڑا چرچا ہوا - بڑے شوق سے کسی سے عاریتاً لے کر دیکھا - ڈاکٹر عبدالرحمن جنوری مرحوم کے لکھے ہوئے مقدمے کا پہلا فقرہ چونکا دینے والا تھا - انہوں نے لکھا تھا کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں ، ”وید مقدس“ اور ”دیوانِ غالب“ - مقدمہ پڑھ کر سخت مرعوبیت کی کیفیت طاری ہوئی - ذہنی طور پر وضو کیا اور با ادب دیوان کا مطالعہ شروع کیا - جگہ جگہ غالب کی مشکل پسندی کی وجہ سے ٹھوکر کھائی - سنبھل سنبھل کے آگے بڑھتا گیا - جب ایسے اشعار پر نظر پڑی ، جن سے امرد پرستی کی بُرائی تھی یا جو نگار ہرجائی سے نوک جھونک پر مشتمل تھے یا جن میں اربابِ اقتدار کی بے جا مدح سرائی تھی تو میرے ناچختہ ذوق نے بھی انہیں الہامی درجہ دینے سے اِبا کیا - احساس یہ ہوا کہ اس بیشہ میں خشک و تر کی آمیزش ہے اور اس خشک و تر کا تنوع بھی نظیری نیشاپوری کے

۱ - نظیری کا شعر ہے :
لیست در خشک و تر بیشہ من کوتاہی
چوب پر نخل کہ منبر نشود دار کتم

تصور سے مماثل نہیں ، جس میں ہر نخل اگر منبر نہیں بن سکتا تو اوجِ دار تک پہنچ جاتا ہے ۔ لہذا مجھے یوں نظر آیا کہ بجنوری مرحوم کے مقدمے میں ایک عظیم شاعر کے لیے جذبہٴ تحسین ادبی توازن پر غالب آ گیا ہے ۔ شاید ان سقیم یا ہست قسم کے اشعار کی ذمہ داری کسی حد تک غالب کے ساجی ماحول اور ماضی کی ادبی روایت پر ڈالی جا سکے۔ لیکن اگر انہیں کسی معنی میں الہامی شمار کرنا پڑے تو پھر گاہے سروش کے غلط آہنگ ہونے کا امکان مشکل ہی سے رد کیا جا سکتا ہے ۔

تاہم دیوان میں اس ناہمواری کے باوجود (اور کسی عظیم شاعر کے ہاں ناہمواری نہیں ہے ؟) کلامِ غالب نے ہم حثیتِ مجموعی میرے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا ۔ اس وقت تک اردو ادب کے سرسری مطالعے نے میرے ذہن میں ، عصری اردو شاعری سے قطعِ نظر ، مغربی ادب کے مقابلے میں اردو شاعری کا کوئی وقیع تصور قائم نہیں کیا تھا ۔ غالب کے مطالعے کے بعد ہم حقیقت دل نشیں ہوتی گئی کہ ہمارے بیش روؤں کی شاعری میں بھی محض ہند و نصائح ، رونا اور دائروں کا پیسنا ، یا مصنوعی حسن و عشق کے معاملات ہی نہیں ہیں بلکہ اس میں جستِ نگاہ اور فردوسِ گوش مقامات بھی ہیں ۔ افس و آفاق کے مشاہدہ پر مبنی حقیقتیں بھی جلوہ افروز ہیں ۔ قہیل کی شاداب مگر فلک شکاف بلندیوں کے مناظر بھی ہیں ۔ مےٴ مرد انکنِ عشق سے آنکھیں لڑانے اور اس سے

نشاطِ زندگی کے حصول کا خود دارانہ حوصلہ بھی ہے اور فکر و جذبہ کی نیرنگیوں کے ساتھ ساتھ ، اظہار و بیان کی شوخیاں اور رنگینیاں بھی جاذبِ قلب و نظر ہیں ۔

آہستہ آہستہ میرے شعور میں یہ احساس ابھرنے لگا کہ جنسِ نابغہ پر کسی خاص زبان و ادب کا اجاڑہ نہیں ہے ۔ اپنے اپنے ماحول اور اس کی روایات کے حلقے میں رہ کر بلند فکر شعرا نے ہر زبان میں روحانی تجربوں اور مسرتوں کا خزانہ اپنے اخلاف کے لیے چھوڑا ہے اور ایسے لوگوں کی تخلیقات زمان و مکان کی حد بندیوں کو توڑ کر جدید ذہن کی پریچ تہوں میں سرایت کر کے ، ہل چل رہا سکتی ہیں ۔ میرے لیے یہ انکشاف مسرت آہستہ تھا کہ اسیویں صدی کے وسط کا ایک اردو شاعر اگر ایک طرف خونِ گرم دھقان میں برقی خرمن کا ہولنی دیکھ سکتا ہے اور ہوں ہیگل کے اصولِ جدلیت کی پیش بینی کر سکتا ہے تو دوسری طرف وہ زندگی کے رجائی چلو پر نظر جا کر ، اس کی کٹھن منزلوں کو منور کرنے کے لیے یہ بھی کہہ سکتا ہے ۔

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

اُس کی عالی ظرفی کا یہ عالم ہے اُسے مزدِ بندگی قبول کرنے سے بھی عار ہے :

طاعت میں نا رہے نہ سے وانگیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

وہ اس دنیائے فانی کے نا پایدار جالِ جاتی اٹائے کو عنیت جان
کر زندگی کے ساتھ ہوں سمجھوتا کر سکتا ہے :

نہیں نگار کو الفت نہ ہو نگار تو ہے
روانی' روش و مستی' ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوبی' ہوا کہیے

اور اے ہر خارِ راہی بھی دعوتِ تشکرِ دینی ہی :

ان آہلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو ہر خار دیکھ کر

اپنے ماضی پر ایک نگاہِ باز رہی۔ ڈالتا ہوں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ غالب نے نہ صرف میرے فرصت کے لمحات کے لیے سامانِ امتزاز مہیا کیا بلکہ میرے دل میں اپنے پرانے ادبی ورثے کا احترام بھی بحال کیا اور میری نظروں میں اس کا یہ کارنامہ اس لیے شاعروں کے اس زمرہ میں شامل کرنے کے لیے

کافی ہے جن کا لطفِ کلام اس دعویٰ کی دلیل بن سکتا
ہے کہ - ع

شعر خود خواہشِ آن کرد کہ گردد فنِ ما

ڈاکٹر قاضی سعید الدین احمد

غالب کی شاعری میں ، میرے لیے ، سب سے زیادہ ناثر پیدا کرنے والی بات اُن کی وسیع العشری ہے ۔ ایسی وسیع العشری جو آفاق قدروں کو گلے لگاتی اور انسانی دوستی کا دم بھرتی ہے میں نے یہ حیثیت معلم (اور طالب علم) جب بھی کلام غالب پر نظر ڈالی ہے تو مجھے لبرل ایمپوکیشن کے جملہ اوصاف اس شاعری میں نظر آتے ہیں ۔

غالب کی ذات اس اعتبار سے لبرل ہے کہ وہ ہر طرح کی فرقہ بندیوں سے بالا تر ہیں ۔ مذہب کے معاملے میں اُن کا ذہن تعصبات سے پاک ہے ۔ علم کے باب میں اُن کا فکر ہمیشہ نئے خیالات قبول کرنے پر آمادہ ہے ۔ گلچر یا تہذیب میں ان کی وسیع العشری اس لیے مسلم ہے کہ ذہن کی تربیت اور فکر کی ولعت ان کا مدعا ہے ۔ رواجی اور پیشہ ورانہ تہذیب ان کے مزاج کے خلاف تھی ۔

غالب تو شاعری کی اُس تعریف پر ہورے اُترے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ شاعر اپنے خیالات کی ایک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے ۔ ایسی دنیا جو مادی دنیا سے بلند اور اس سے

ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے۔ فکر کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ ہم رفعت کی اس منزل پر پہنچ جاتے ہیں جسے Sublimity کا نام دیا گیا ہے :

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا کاش آسماں اپنا

بعض لوگ شاعر کو فلسفی کہہ کر اور اس کے کلام کو ایک یا کئی فلسفوں کا ترجمان سمجھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ سیرے خیال میں شاعر کا منصب منطقی فلسفہ داں سے مختلف ہے۔ انکار خواہ کتنے ہی فلسفیانہ کیوں نہ ہوں اگر خیال میں شعر کی دلاویزی یعنی ذہن کے ارتعاش میں دل کی دھڑکن شامل نہیں تو اسے خواہ کلام موزوں کہہ لیجیے، سخن دل پذیر ہرگز نہیں کہہ سکتے اور شعر و سخن دل پذیر نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

غالب کسی مکتبہ فکر کے مقلد یا مبلغ بن کر شاعری نہیں کرتے۔ نہ اس سے ان کے خیال میں شاعر کی آبرو بڑھتی ہے۔ غالب نے ذہن کی دقیق اور فلسفیانہ موسکافیوں کو بھی جب شعر کے قالب میں ڈھالا تو اثر آفرینی پر ہرگز حرف نہیں آنے دیا۔ ذہن کی بات کو دل کی بات بنا کر نشاطِ خاطر کا سامان فراہم کیا۔

ان کے یہاں عقلیت ضرور ہے مگر کسی مسلسل نظام فکر کی تدوین کے لیے نہیں۔ وہ اعلیٰ اخلاقِ انسانی کے گرویدہ

ضرور ہیں مگر کوئی دستور اخلاق مرتب کرنے کے خواہشمند نہیں۔ وہ اصلاحِ عمل کے قائل ضرور ہیں مگر مصلح کا روپ دھارنے پر رضا مند نہیں۔ اس لیے کہ ان میں سے کوئی منصب شاعر کا منصب نہیں ہے۔ غالب ایسے ربو و ریا سے دور بھاگتے ہیں۔

اس پر گزرے نہ کہاں ربو و ریا کا زہار
خالص خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

فلسفہ ذاتی کے متعلق مثلاً یہ شعر :

طاقت میں تارے نہ مے وانگیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

یہاں غالب کے نام سے کوئی فلسفہ تعبیر کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ عبادت کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ عبادت جو جنت کے لالچ سے کی جاتی ہے۔ یہ عبادت نہیں تجارت ہے۔ دوسری وہ عبادت جو دوزخ کے خوف سے کی جاتی ہے۔ یہ عبادت نہیں کمزوری ہے۔ تیسری وہ عبادت ہے جو محض اس لیے کی جاتی ہے کہ خدا کی ذات عبادت کے لائق ہے۔ یہ سچی عبادت ہے۔ مگر اول تو یہ نظریہ عبادت غالب کا تخلیق کردہ نہیں ہے، پیغمبروں کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ عبادت کا متذکرہ بالا مفہوم لے کر چلنے والے جنت کی طمع اور جہنم کے خوف کی عبادت کو روا سمجھنے

ہیں۔ غالب ان کے مقابل ہو کر کسی موقف کی تشہیر کا داعی نہیں ہے وہ تو آزادمنش ہونے کی وجہ سے اپنے طور پر اپنے شدید رد عمل کا اظہار کرتا ہے ایسا شدید رد عمل جس کے تحت اسے دوزخ و جنت کا وجود بھی گوارا نہیں ہے۔ وہ تو گویا خدا کے اس عمل پر کڑھتا ہے کہ آخر ان طمع سازیوں اور دہشت خیزیوں کی ضرورت کیا ہے ؟ اس طرز فکر کو میں غالب کی ذہنی تہذیب (Intellectual culture) کا نام دیتا ہوں جو وسیع الخیال لوگوں کا وصف خاص ہے۔

غالب کی وسعت فکر کا دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ وہ کسی کے طرف دار بننے پر آمادہ نہیں۔ شاعری کے منصب میں وہ انتہائی حق گو بلکہ صاف گو ہیں یعنی جو بات ان کے دل و دماغ کو حق لگے وہی حق ہے۔ غالب خود اپنے طرف دار نہیں ہیں تو دوسروں کی طرف داری کیوں کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ پیشہ کی وجہ سے فرہاد کے نام رکھے جائیں تو غالب سینہ سپر ہو کر سامنے آتے ہیں اور اس کی آشفٹہ سری کو نباہنے میں۔ لیکن اگر وہی فرہاد تہشے کا منت کش بن کر مرنے کی تدبیر کرے تو اس کے عمل کی فرسودگی اور رسوم و قیود کی پابندی پر طعنہ زن ہو جاتے ہیں۔ بے جا روایت کی جکڑ بند سے آزاد ہونا ہی آزاد طبع شاعر کی خصوصیت ہے۔

غالب اس حد تک آزاد منش ہیں کہ ان کے خیال میں

اگر کوئی اعتراض ذاتِ واجب پر بھی وارد ہوتا ہے تو اس کو وہ دل میں نہیں رکھتے۔ مسئلہ خواہ معاش کا ہو خواہ معاد کا وہ اپنے منفرد اندازِ فکر اور ممتاز اندازِ تعریف سے نہیں ہٹ سکتے۔ انسان کو جب ذہن ملا تو اظہارِ رائے کے حق سے وہ دست بردار کیوں ہو تخلیق کا عارضی کبیل ہو یا معاد کا ہنگامہ یہ ایک عالمِ کل اور ذاتِ دانا و بصیر کے لیے کیا ضروری تھا۔ 'ہونے' میں پکھڑا ہے 'نہ ہونے' میں سکون تھا 'نہ ہونے' میں عالمِ ارواح کے اعلیٰ ترین امکانات تھے۔ اور 'ہونے' میں عالمِ آب و گل کی ذلتیں ہیں دوسرے یہ کہ خوب ہوالعجبی ہے کہ فرشتے جو رتے میں انسان کے برابر ہیں نہ احساساتِ بشری کو سمجھنے کے اہل وہ اس کی فردِ جرم لکھنے پر کیوں مامور ہوں۔ باتِ ملائیت یا کج بختی کی نہیں ہے۔ نہ ایسے لوگوں سے انہیں کوئی دلچسپی ہے۔ غالب تو اپنی نہیچِ فکر کو دل کی دھڑکنوں کے ساتھ پیش کرنے سے مطلب رکھتے ہیں۔ اس کے لیے موضوع کی کوئی تخصیص یا استثناء بھی نہیں۔ شاعر جو بھی دیکھتا، سوچتا اور محسوس کرتا ہے اسے اپنی انفرادیت کے آئینہ میں دکھاتا ہے۔ بعد میں یہی بے باکی اقبال کے جہاں ابھرتی ہے۔

غالب کے جہاں صرف ایک حصار ہے۔۔۔ السالیت کا حصار، جس میں یہ رند ہزار شہوہ کل روشن خیال اہلِ دل کا ہم

منسوب ہے ۔ یہ رند سجدہ گزار بھی ہے مگر ایسے مسجود کا
جو ادراک کی سرحدوں سے ماوراء ہے کعبہ و دیر کی حد بندیاں
اس کے پاؤں پر معنی ہیں ۔ اور غالب سے — میرا ذہنی رشتہ
اسی اساس پر قائم ہے ۔

ڈاکٹر سید عبداللہ

غالبؑ سے میری نیاز مندی ہرانی ہے ۔ بہت ہرانی ، —
اس وقت سے جب میں ابھی لام الف لکھتا تھا دہوار دہستان
پر ، پہلی مرتبہ پانچویں جہانت کے نصاب اردو میں غالب
سے روشناسی ہوئی اور ابتدا اس شعر سے ہوئی —

کوئی امید بر نہیں آئی
کوئی صورت نظر نہیں آئی

اس شعر کا اس وقت بڑا اثر ہوا ، اس زمانے کو میرا
بچپن کہیے یا لڑکپن ، عمر کے اس مرحلے میں ، صنفِ دل پر
بے امیدی کی ایک تصویر سی جم گئی ۔ اس وقت مجھے کچھ
ابھی معلوم نہ تھا ۔ کیا امید تھی جو بر نہ آئی تھی اور کون
سی صورت تھی جس کی آرزو تھی ، مگر یہ واقعہ ہے کہ
اس شعر کا بڑا اثر ہوا ۔ یہ شعر اکثر وردِ زبان رہا کرتا ۔

۱ ۔ غرض ہوا میں نے اس موضوع پر ایک مضمون لکھا تھا :
”غالب میرا دوست ۔ میرا رازدان“ — ، موجودہ یاد داشت
میں اس مضمون کے کچھ حصے شامل ہیں ۔

مجھے اپریل کے وہ دن خوب یاد ہیں جب جبڑی ، (مانسہرہ میں چھوٹا سا چشمہ) کے کنارے بہار کے تازہ ترین جنگلی پھول سبزے سے ابھر ابھر کر مجھ سے ہم کلامی کرنے لگتے اور میں ان کی گفتگو سے لطف الدوز ہونے کے لیے ارد گرد کی باہم ملتی ہوئی پہاڑیوں کے درمیان ، چروں فرش گیہا پر بیٹھ کر ، بے امید کی نغمے شوق دل سے الاہا کرتا ۔ اس وقت سب سے زیادہ یہی شعر ، ترجان حال ہوا کرتا ' ۔

میرا مزاج ہوں بھی مائل بہ یاس ہے مگر اس کچی عمر میں یہ نقش بے امیدی عجب انداز میں نقش پذیر ہوا ۔ ہوں اس کیفیت میں بھی ایک مزا ضرور تھا مگر تعلیم و تربیت کے نقطہ نظر سے اب مجھے سقراط کی وہ نصیحت یاد آتی ہے جو افلاطون کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے ۔ سقراط نے ادب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا :

”کیا ہم بے پروائی کے عالم میں اس امر کی اجازت دے سکتے ہیں کہ ہمارے مجھے وہ حکایتیں سنیں اور بڑھیں جن سے ان پر وہ اثر ہو جو ہم نہیں چاہتے کہ ان پر پڑے ہو کر برا اثر ڈالے ۔ ہرگز نہیں ! تو پھر

۱ - اسی زمانے میں ذوق کے یہ اشعار بھی پڑے تھے :

آئی ہے جدائے جرس ناقہ لیلیٰ
صد حیف کہ مجنون کا قدم تالہ نہیں سکتا

سب سے پہلے ہمیں انسانی ادب پر احتساب قائم کرنا ہوگا۔

یہ سقراط کے الفاظ تھے جن کو تقریباً ہر ماہر قریت نے اپنے اپنے زمانے میں دہرایا ہے اور میں کہتا ہوں کہ مناسب ہوگا کہ اس قسم کا احتساب شاعری کے نصابوں پر بھی قائم کیا جائے تاکہ بچپن ہی سے بچوں کے ذہن پر وہ نقشی جم نہ جائیں جن کو بعد میں دور کرنا مشکل ہو جائے۔

پھر حال غالب سے میری پہلے علیک سلیک اس فضا میں ہوئی، اس کے بعد میں طویل مدت تک غالب سے بے خبر و بیگانہ رہا۔ اس عرصے میں مجھ پر کچھ اور قسم کے نشے غالب سے، طالب علمی کے رنگا رنگ دور چلتے رہے اور ان کے ساتھ میرے ذوق کے رنگ بھی بدلتے رہے، ان میں سب سے زیادہ سیاست کا ذوق تھا۔ پھر جب سیاست کے ہنگامے خاموش ہو گئے اور قومی زندگی کے سب نشے ہرن ہو کر، ریخ خار میں بدل گئے تو میں نے اپنی تعلیم میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لی اور اس مرتبہ ایک ایسے شخص سے میرا تعارف ہوا جس کی شخصیت میں کمال علم کے باوجود قدرے آشتی بھی تھی۔ وہ میرا استاد بھی تھا اور مرہی بھی۔ اکثر شاموں

۱۔ اشارہ بروینسر خواجہ محمد سلیم کی طرف ہے جو چند سال قبل تک پہلے گورنمنٹ کالج لاہور اور بعد میں اورینٹل کالج لاہور (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کو اس کے دیوان خانے میں میرے جیسے ”شاگردِ پیشہ“ اور
 ہزار احباب جمع ہوتے اور فلسفہ و شعر اور ادب و فن کے متعلق
 گفتگوئیں ہوتیں۔ پھر جب بھیڑ چھٹ جاتی تو یہ شخص ہر درد
 لہجے میں غالب کے چیدہ اشعار کا یا کرتا۔ ان میں سے دو شعر
 آج تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔۔۔

سنبھلے دے مجھے اے نا امید کیا قیامت ہے
 کہ دامنِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

اسد بسمل ہے کس الداز کا ، کہتا ہے قائل سے
 تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

خواجہ محمد سلیم صاحب کے توسط سے ”محاسنِ کلامِ غالب“
 (عبدالرحمن بجنوری) کا بھی پتہ چلا۔ اس کے مطالعہ سے بڑی
 ذہنی کشادگی پیدا ہوئی !

غالب سے روشناسی کی یہ دوسری اہم تقریب تھی اور
 اتفاق سے اس مرتبہ پھر وہی بے امید بلکہ نا امید ۔

اس کے بعد دیوانِ شمس تبریز کے مطالعہ کا اتفاق ہوا۔
 نظیری کا مطالعہ پہلے کر چکا تھا مگر روسی کی غزلیات نے

(گفتہ صفحے کا پتہ حاشیہ)

میں انگریزی کے استاد تھے۔ وہ مشرق اور مغرب ادبوں سے
 یکساں دل بستے رکھتے ہیں۔ فلسفہ ان کا خاص مضمون ہے
 مگر رموزِ ادب کے شناساے کامل ہیں۔

کچھ اور ہی لطف دیا۔ چنانچہ اس کے مطالعے سے غالب کی شاعری کا دامن پھر مجھ سے چھوٹ گیا اور میں روسی کی ہر شور غزل میں محو ہو گیا۔

۱۹۲۳ء میں مجھے خلاف معمول سردیوں کے موسم میں ہزارہ جانے کا اتفاق ہوا۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور جاڑے کی طویل قہر آنود راتیں۔ درد تنہائی نے کاٹنا شروع کیا :

کاوِ کلوِ سخت جانی ہاے تنہائی نہ ہوچہ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

ایک دو کتابیں احتیاطاً ساتھ رکھ لی تھیں۔ ان میں ایک سہا کی مطالب الغالب (شرح کلام غالب) تھی جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا۔ میں نے اس کو درد تنہائی کا درمان بنا لیا اور ایک ہفتہ کے اندر اندر، چراغ سفل کی روشنی میں، یہ ساری شرح پڑھ ڈالی۔ اس سے میری نظر میں غالب کے متعلق کچھ وسعت پیدا ہوئی اور مجھے پہلی مرتبہ کلام غالب میں نا اسیدی کے علاوہ کچھ اور مطالب بھی نظر آئے۔ اس موقع پر میں نے حسن و محبت کے مضامین سے خاص دلچسپی لی۔ ادھر (۱۹۲۵ء میں) ایم۔ اے فارسی میں غالب کے فارسی کلام کا جبری مطالعہ کرنا پڑا۔ اس ذریعے سے میرے پہلے تاثر کا کچھ رنگ بدلا اور مجھے اس شاعر کی گہرائیوں اور وسعتوں تک پہنچنے کا ہلکا ہلکا خیال ستانے لگا۔ لیکن یہ اس

واقعہ ہے۔۔۔ کہ فارسی کلام غالب کی چہری تدریس سے میں کچھ زیادہ متاثر نہ ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اشعار کا ترجمہ انگریزی میں کیا جاتا تھا لہذا تشریح بقدر ذوق ممکن نہ تھی۔

میں نے اپنے مطالعہ غالب کی یہ ابتدائی سرگزشت اس لیے لکھی ہے کہ یہ میری آئندہ کی سرگزشت کی تمہید بن سکے۔ میرے مطالعہ کا یہ ابتدائی دور بڑی حد تک جذباتی مطالعہ کا دور تھا یعنی اپنے جذبات کی تسکین کا دور۔ میں کہہ چکا ہوں کہ ابتدائی دور میں سیاسی تفکر مجھ پر غالب تھا اس لیے میں اردو کی قومی شاعری کو دوسری انواع شعر پر ترجیح دیتا تھا۔ مگر جب قومی شاعروں کا رنگ بھیکا پڑا تو اردو میں حسرت اور فارسی میں نظیری نے اور ان سے بھی زیادہ حافظ و اقبال نے مصروف رکھا۔ لیکن چونکہ میرے دل میں غالب نے اپنا مقام بنا لیا تھا اور وہ مقام آج تک اس کو حاصل ہے اس لیے گاہ میں دیوان غالب کی طرف بھی متوجہ ہوتا رہا۔ میں مطالعہ غالب کا تذکرہ کر کے اپنے لیے کسی انفرادی امتیاز یا یکتائی کا دعویٰ نہیں کر رہا ہوں۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ جس شخص نے زندگی میں غالب سے کبھی سروکار ہی نہیں رکھا وہ ازل سے بہرہ بلکہ ناتراشیدہ اور بدذوق ہے۔ غالب ان شاعروں میں سے ہیں جن سے تعلق رکھے بغیر

کوئی شخص نہ لکھا پڑھا ثابت ہو سکتا ہے ، نہ خوش ذوق
 اس وقت بڑا سوال یہ ہے کہ غالب نے مجھے کہا دیا اور
 وہ میرے لیے کس کس انداز میں باعث تسکین ثابت ہوا ۔
 میں یہاں غالب سے اپنے تعلق کا اسی نقطہ نظر سے ذکر
 کر رہا ہوں ۔

مطالعہ غالب کی یہ کہانی چونکہ ذاتی اور شخصی ہے
 اس لیے مجھے یہ کہنے میں قائل نہیں کہ زندگی میں میرے
 مجھے جو الم دیا ، میں اکثر حالات میں اس کی تلافی دیوان
 غالب یا دیوان حافظ سے کرتا رہا ، اور ان دونوں کے یہاں
 سے مجھے نسخہ شفا مل بھی جاتا رہا ۔

یوں تو مطالعہ غالب میں ذوق راحت کی کئی صورتیں
 موجود ہیں ۔ معاملات محبت ، حسن و جمال محبوب کی دلفریب
 تصویریں ، ناز و ادا کے ظاہر اور چھپے ہوئے نکتے ، حقائق
 کائنات کے انکشافات ، طرز ادا کے اعجاز ، شوخی بیان کے
 کرشمے ، اور صنعت گری و تخیل کی شان ، یہ سب
 باتیں کلام غالب میں درجہ بدرجہ اور جا بجا جلوہ ریزی مگر
 زندگی کے جذباتی یا ذہنی حوادث میں غالب سے جو رہنمائی
 مل سکتی ہے (اور مجھے ملی) وہ بذات خود ایک مستقل
 موضوع ہے ۔

۱۹۵۳ء کے اواخر میں مجھے یوں محسوس ہوا گویا

زندگی کی دھوپ پٹی بڑی جا رہی ہے درختوں کے
 سائے اپنی اصلی قامت سے کچھ زیادہ ہی لمبے معلوم ہونے
 لگے ۔ کچھ یہ بھی احساس ہوا کہ زندگی کو کوئی جس نظر
 سے دیکھے (حکایت صبر گریز یا شکایت رنج گران لشین) ،
 حقیقت صرف یہ ہے کہ بے وفائی اس کی سرشت میں ہے ۔ اس
 خیال کے تحت اپنی ضعیف الاعتقادی کے باوجود میں نے اپنے
 لیے ایک فلسفہ مرتب کیا اور وہ یہ کہ صرف جال حیات پر
 نظر رکھی جائے اور مقدر جو کچھ بھی عنایت کرے اس کو
 ارمغان ہزندی سمجھ لیا جائے جہاں تک کہ غم و الم
 کو ایک ہنگامہ زیست سمجھ کر خود اسے بھی سامان حیات بنا لیا
 جائے اس لفظ میں غالب کے بعض اشعار سے بہت
 اسناد ملتی رہی ۔ مثلاً

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
 بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

یا مثلاً یہ شعر :

دلا یہ درد و الم بھی تو مغنم ہے کہ آخر
 نہ گریہ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

بظاہر اس قسم کے اشعار میں افسردگی ہی کا ایک خاص
 رنگ ہے مگر یہ افسردگی دل کے بیہ جانے کے مترادف نہیں ،
 یہ تو اس حالت کا نام ہے جسے یوں سمجھا جائے گویا راکھ

میں کچھ چنگاریاں ابھی سلگ رہی ہوں اور انہی سے دل کی
 الکیٹھی گرم گرم محسوس ہوتی ہو۔ غالب کے ذہنی کیفیات
 میں اس طرح کی حسرت بھی ہر لطف ہے اور اسے آرزوئے
 زندگی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، مندرجہ بالا اشعار میں جو
 کیفیت ہے وہ حسرت سے زیادہ پر اضطراب اور ہر لطف ہے۔
 اس رجحان کو ذہن غالب کا ایک خاصہ سمجھا جا سکتا ہے،
 یہ اس حالت میں بھی قائم رہتا ہے جب کہ ہاتھ میں جنبش
 بھی باقی نہیں رہتی اور دم صرف آنکھوں میں سمٹ کر رہ
 جاتا ہے۔

کلام غالب کے اس عنصر نے مجھے بہت متاثر کیا اور
 میں نے غم کو کبھی بنانے میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ یہ
 حقیقت ہے کہ اس قسم کے اشعار سے طبیعت میں ہموازی اور
 دل میں سکون پیدا ہوتا رہا۔ مجھے یہاں یہ اعتراف کرنا ہے کہ
 جہاں میں نے کلام غالب کے اس حصے سے بہت فائدہ اٹھایا
 وہاں بعض دوسرے حصوں سے اتنا اثر نہیں لیا جتنا متوقع
 تھا۔ مثلاً زندگی کی بغاوت شدید کیفیتوں والے اشعار سے میں
 اس لیے کم مستفید ہوا کہ اس معاملے میں میرا ذوق ان سے
 زیادہ میرے نشانی پاتا ہے، اور میرا خیال یہ ہے کہ ایسے
 اشعار میں غالب نے میرے ہی کے جواب میں ہیجانی کیفیت پیدا
 کر کے قائل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

غالب کے یہاں جو دعوت انقلاب ہے۔۔۔۔۔ وہ اپنی جگہ خوب ہے مگر اقبال کے مطالعے کے بعد یہ دعوت بھی بے غایت معلوم ہوئی۔ اور کہیں کہیں تو محض بلند ہائی کا احساس ہوا۔ مثلاً غالب کی اس فارسی غزل میں کس قدر ادعا ہے (صرف مطلع درج ہے)۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
فضا بگردشِ رطلِ گران بگردانیم

اس غزل میں بڑی للکار اور ہکار ہے مگر اس کھن گرج کے اندر دعوت انقلاب کی غایت کچھ بھی نہیں نکلتی خصوصاً جب کوئی یہ سوچنا ہے کہ یہ سارا ہنگامہ صرف ایک ”زن عشوہ گر“ کی ملاقات خلوت کے لیے تھا۔ اس کے مقابلے میں حافظ کا وہ احتجاج کتنا قدرتی اور مؤثر نظر آتا ہے جو اس غزل میں بیان ہوا ہے جس کا مطلع یہ ہے :

این چہ شورے است کہ در دور قعر می بینم
ہمہ آفاق ہر از فتنہ و شر می بینم

عین ممکن ہے کہ میری یہ رائے میری سوچ کے مختلف انداز کی وجہ سے ہو مگر میرا اندازہ یہ ہے کہ غالب نے زندگی کی بے غایت انقلابیت کو اپنا کر اپنے فطری میلان سے انحراف کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں ان کا وہ رویہ زیادہ نتیجہ خیز ہے جو زندگی میں مساوت کا سبق سکھاتا ہے۔ اگر بھیہے اپنے

نقطہٴ نظر یا تاثر کے مطابق بات کرنے کی اجازت دے دی جائے تو میرے لیے غالب کا مندرجہ ذیل ایک شعر زندگی کی عظیم حکمتوں سے مالا مال ہے اور میں نے اپنی بے حاصل و بے نتیجہ زندگی میں اس کو اکثر مشعل راہ بنایا ہے ۔ شعر یہ ہے :

تو نالی از خاہ" غار و لنگری کہ سپر
سر حسین" علی" ہر سنان بگرداند !

غالب کے یہاں نظام کائنات یا "قاعدۂ آسمان" کو بدل کر رکھ دینے کی جو پکار ہے اس سے میں متاثر نہیں ہوا ، میرا انداز فکر مجھے ہمیشہ یہ سمجھاتا رہا کہ زندگی کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس کی بنا مجبوری کے عنصر پر رکھی گئی ہے ۔ ۔ آخر "کچ دار و مریز" کا الکشاف یوں ہی تو نہیں ہو گیا تھا ! ۔ ۔ اس جہان رنگ و بو کی عجیب عجیب ریتیں اور رسمیں ہیں ۔ ان میں ایک مرحلہ یا کوئی مرحلہ ضرور آتا ہے جس میں شرافتوں کے تقاضے مسلک تسلیم پر مجبور کر دیتے ہیں ۔ غلبہ اور ہلغار کامیابیوں کا ایک اچھا ذریعہ ہے مگر کیا غلبے کی قاہری ہر صورت کے لیے موزوں ہے ؟ میرا خیال ہے کہ نہیں ! ۔ ۔ ۔ اگر لسل السانی غلبے کی قاہری کے بجائے مقاومت محبت کے اصول پر عمل کرتا سیکھ لے تو ممکن ہے دنیا ایک معمورہ انس بن جائے ۔ ۔ ۔ محبت کی یہ مقاومت بہت کم انسانوں کو میسر

آئی ہے ، - - - - ان میں حسین ابن علی بھی ایک بڑا ، بہت بڑا انسان تھا جس کی جنگ شمشیر کی جنگ ہونے کے باوجود، محبت ہی کی جنگ تھی - - مگر محبت کی اس جنگ کا اوپن اصول تھا : ہولناک شدائد میں بھی ماتھے کا سکون اور آنکھوں کا وقار قائم رکھنا ! - - غالب کا جو نقطہ نظر مندرجہ بالا شعر میں ظاہر ہوا ہے وہ ان کے ”جارجانہ اور حریفانہ کھینچے“ کے اسلوب سے آونچا ، بہت آونچا ہے - - ! اور میں نے اپنے تفکر میں اس نقطہ نظر کو بہت آونچی جگہ دے رکھی ہے !

ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ میں نے اپنی جذباتی کیفیتوں کے حوالے سے غالب کی غزل کو دیکھنا شروع کیا - اور یہ بھی سمجھنا چاہا کہ بلند پایہ غزل گوؤں کی غزل میں مرکزی جذبوں اور ثانوی جذبوں کی باہم کیا نسبت ہوتی ہے - اس طرز مطالعہ نے (کم از کم غالب کے سلسلے میں) مجھ پر یہ منکشف کیا کہ غزل کا مرکزی جذبہ ضروری نہیں کہ مطلع میں ، یا کسی پورے شعر میں ظاہر ہوا ہو - غزل لکھنے والا، جذبے کی کسی تحریک سے ، فوراً کچھ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے - اس مجبوری کے عالم میں ، کوئی مصرع یا کوئی شعر - - - خصوصاً کوئی ایک مصرع سب سے پہلے ظہور میں آتا ہے ، اور وہی غزل کا مرکزی مصرع یا شعر ہوتا ہے ، غزل کا باقی ڈھانچا بعد میں تیار ہوتا ہے اور اس مرکزی جذبے کے گوشت پوست کی حیثیت

نمائندگی کرنے والی غزلیں الگ الگ کی جا سکتی ہیں ۔ اور زوال شباب کی الگ ، (اور ان کی تعداد زیادہ ہے) ۔ (میرا یہ فیصلہ ذاتی ہے ۔ ممکن ہے کسی اور طالب علم کو اس آئینے میں کچھ اور نظر آتا ہو) ۔ اسی لیے کسی نے کہا تھا کہ غالب زوال شباب کے احساسات کا شاعر تھا ۔

تدریسی ضرورتوں نے بھی غالب پر غور و فکر کا موقع دیا ۔ اگر مدرس ہو کر اچھا تنقیدی شعور بھی قائم رہے تو اسے غنیمت سمجھنا چاہیے ، میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اس شعور کو قائم رکھ سکا یا نہیں ، مگر میری یہ آرزو رہی ہے کہ مجھے معارف غالب کی بصیرت حاصل ہو جائے ۔ اس لیے اکثر غور و فکر سے مطالعہ کرتا رہا ہوں (میں نے کئی برس ادیب فاضل جامعہ کو دیوان غالب پڑھایا اور میرا خیال ہے کہ میں بات پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا رہا) ۔ اور میرا خیال ہے کہ میں بعض موقعوں پر کچھ نئی چمک پا لینے میں کامیاب بھی ہوا ہوں ۔

یہ بحث بہت طویل ہے اور ایک مستقل مضمون کی طلب گار ہے ۔ یہاں میں ایک دو باتوں کا مختصر تذکرہ کرتا ہوں جن کا تعلق شرح اشعار سے ہے ۔

غالب کا احساس کمال اور ان کی خود نگری ایک مسلم واقعہ ہے ۔ اس احساس نے ان کے کلام میں طرح طرح کے

اثرات چھوڑے ہیں۔ ان کا رشک اس کا ایک اہم پہلو ہے۔ مگر اس کی ایک دلچسپ صورت دنیائے کمال کی نامور شخصیات کے متعلق غالب کا ذہنی رویہ ہے۔ اپنے احساس کمال کے معاملے میں غالب کا شعور اتنا منفرد تھا کہ وہ ناموری کے انتساب میں اپنے علاوہ کسی اور کی شرکت کو غیر شعوری طور پر بھی پسند نہیں کرتے، یہ صحیح کہ اس میں ان کی طرف سے عدم احترام کا کوئی شائبہ نہیں مگر تشکیک ضرور ہے۔ ان کا یہ رویہ غیر شعوری ہے اور اس میں وہ مجبور و معذور ہیں مطلب یہ کہ جذباتی اور روحانی دنیا کے جو مسلم پیرو ہیں غالب ان کو پیرو مانتے تو ہیں مگر کوئی نہ کوئی پیرایہ ایسا ضرور اختیار کر جاتے ہیں جس سے ان ناموروں کی شہرت و ناموری میں تشکیک یا تردید کا پہلو نکل آتا ہے۔

یہ خاص بات غالب کے اہم نفسی خصائص میں منجملہ کاہدی امور کے ہے چنانچہ اس کو مدنظر رکھ کر ان کے متعدد اشعار کی شرح آسان ہو جاتی ہے جو شارحین کے یہاں الجھ می گئی ہے۔

غالب کا ایک شعر ہے :

جز قیس اور کوئی نہ آیا پروئے کار
صحرا مگر بہ لنگی چشم حسود تھا

عام خیال کے مطابق شعر کا پہلا مصرع محض خبر یا محض

یہاں ہے ۔ شارحین کہتے ہیں : غالب کے نزدیک ”جز قیس اور کوئی بھی“ عشق کی ذمے داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکا کیوں کہ صحرائے عشق چشم حاسد کے مانند تنگ تھا اور اس میں کسی کا گزر ممکن نہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ البتہ ان میں ایک قیس تھا جس سے یہ ہو سکا ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی قیس کو اس معاملے میں یکتائی حاصل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ !

مگر غالب کے عام رویے کی روشنی میں یہ شرح صحیح نہیں ۔ میرے نزدیک شعر کا مصرع اول طنزیہ تعجب کا حامل ہے اور اس میں اس عام خیال کی تشکیک بلکہ تضعیف ہے کہ قیس ہی عشق کی دنیا کا واحد ہیرو تھا اور عاشقی کی ریت اس پر ختم ہو گئی ۔ غالب کی رائے میں یہ خیال مضحکہ خیز ہے کہ عشق کے ممکنات کو اتنا محدود سمجھ لیا جائے کہ اس کو قیس کے فہرہات تک منحصر کر لیا جائے ۔ عشق کے تو ہزاروں ممکنات ہیں اور ان میں قیس کے علاوہ اور بھی بے شمار نامور پیدا ہو سکتے ہیں یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ قیس کے بعد عاشقی کی دنیا سنسان ہو گئی ہے ۔ ۔ ۔ یہاں تو ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں! غالب وسعت طلب اور نصب العینی شاعر تھا اس لیے وہ ممکنات کو ماضی میں محدود رکھنے کے حق میں نہیں ہو سکتا ۔

بہر حال اس ایک شعر کی روشنی میں غالب کے کئی

دوسرے اشعار کی شرح کی جا سکتی ہے اور اس طرح ان کے ایک اہم نفسیاتی رجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگر اسی انداز میں ذیل کے چند اشعار کی تشریح کی جائے تو معانی کا رخ ہی بدل جائے گا۔

مائع وحشت خراسی ہائے لیلیٰ کون ہے ؟
خانہٴ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا
کوہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد
سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا
قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنگ ظرفی منصور نہیں
عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم فکو ناسی فرہاد نہیں
بیشے میں عیب نہیں دکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفہ سرون میں وہ جوان میر بھی تھا
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاودان کے لیے

خود نگری کی یہ نفسیاتی صورت ایک حد تک میر تقی میر نے بھی اختیار کی ہے مگر انہوں نے کوہکن و مجنون کے متعلق قدرے مصالحت کا رویہ اختیار کیا ہے۔۔۔ اور انہیں ”عزت داروں“ میں شمار کر کے ان کے کمال میں کچھ زیادہ

رخنے نہیں نکالے البتہ مسیح و خضر سے ضرور الجھے ہیں ۔ غالب کا رویہ معروف السانوی شخصیتوں کے متعلق بالکل مختلف ہے ۔ میں نے غالب کے تدریسی مطالعے کے دوران اس طرح کے کچھ اور کاہدی نکتے بھی دریافت کیے ہیں ۔ مگر اس مختصر یاد داشت میں ان کا احاطہ ممکن نہیں ۔ ان میں سے اہم نکتہ یہ ہے کہ کلام غالب کو مغل تہذیب کے سماجی و ادبی احوال کی روشنی میں پڑھنا چاہیے ۔ اس طریق مطالعہ سے ، حقائق غالب کا وسیع تر انکشاف ممکن ہے ۔

ایک قابل توجہ امر یہ ہے کہ کلام غالب کو فنون لطیفہ کے حوالے سے دیکھا جائے ، یہ کام عبدالرحمن چغتائی نے کیا ہے ۔ مگر غالب کے فنی امکانات اس سے وسیع تر ہیں ۔ غالب کو مغل دور کے جملہ فنون لطیفہ کی روشنی میں پڑھنے کی ضرورت ہے ۔

ایک اور پہلو یہ ہے کہ غالب کی ساری شاعری کو باہم ملا کر پڑھا جائے اور اردو اور فارسی کی شاعری کے انذات اور اختلافات کی شرح لکھی جائے ۔ اب تک (جہاں تک مجھے معلوم ہے) یہ کام بہت کم ہوا ہے ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم نے انکار غالب میں اور شیخ محمد اکرام نے غالب سے متعلق اپنی کتابوں میں کچھ کام کیا ہے اور پروفیسر شیرانی بھی اس نظر سے غالب کو دیکھنا چاہتے تھے مگر عمر نے

وفا نہ کی ۔ ان کے کتب خانے سے دیوان غالب کا ایک نسخہ
 بولینورسٹی لائبریری میں منتقل ہوا ہے ، اس کے حواشی سے
 اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اس طرز مطالعہ سے بڑی دلچسپی
 رکھتے تھے مگر ان سے تکمیل نہ ہو سکی ، اب یہ ادبی فرض
 کسی اور کو انجام دینا چاہیے ، عموماً غالب کو فارسی کے
 شاعر اور اردو کے شاعر کے طور پر الگ الگ دیکھا جاتا ہے ۔
 انہیں مکمل شاعر کے طور پر دیکھنے کی رسم ابھی عام نہیں
 ہوئی ۔ ۔ ۔ اس سے ان کی ادبی شخصیت دو حصوں میں بٹ
 جاتی ہے اور اس تقسیم سے غالب کا نقصان بھی ہے اور ان
 کے ساتھ نا انصافی بھی ، چونکہ غالب کا ذہن اور ان کی ادبی
 صلاحیت دونوں زبانوں میں محفوظ ہے اس لیے صحیح طرز
 مطالعہ یہی ہے کہ دونوں دواوین کو یکجا دیکھا جائے ۔
 نمائندہ اشعار کو جمع کیا جائے اور مختلف المضمون اشعار کا بھی
 تجزیہ کیا جائے ، اس طرح زبان کے فرق کے باوجود غالب کی
 مکمل شاعری کو مرتب انداز میں پیش کیا جاسکے گا ، میں نے
 اس سلسلے میں کچھ کام کیا ہے ، مگر اس وسیع کام سے
 عہدہ برآ ہونے کے لیے فرصت کی ضرورت تھی ، وہ مجھے
 نہیں ملی ۔ ۔ ۔ ہر صورت آرزو تھی اور ہے کہ غالب کو
 اس طرح بھی دیکھ سکوں ۔

یہ ہے غالب سے میری لیا ز مندی کی کہانی ۔ میں چاہتا

تو اس کو پھیلا کر کتلب بنا دیتا ۔ مگر میں مختصر کہانی کو ناول پر ترجیح دیتا ہوں ، ممکن ہے کوئی دوسرے صاحب اس داستان کو اپنے عمیق تر مطالعے سے اور زیادہ پھیلا دیں ۔

میں نے اپنی طرف سے آشنائی کا تھوڑا سا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے جسے میں مدۃ العمر کی آشنائی کہہ سکتا ہوں ! شاید اس جہانے غالب شناسوں کی فہرست میں میرا نام بھی کسی ذیلی حاشیے میں درج ہو جائے !

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مولانا شبلی نے ایک خط میں عطیہ بیگم فیضی کو لکھا ہے کہ اگر تم کسی زبان اور اس کے ادب کا ذوق پیدا کرنا چاہتی ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس زبان کے ہلکے پھلکے اور آسان شعر بار بار پڑھیں۔ یہاں تک کہ تمہیں اس میں لطف آنے لگے۔ مثلاً مرزا داغ کا یہ شعر :

بات کرنی تک نہ آتی تھی تمہیں
یہ ہمارے سامنے کی بات ہے

مولانا نے جو کچھ فرمایا بالکل بجا فرمایا اور درست مشورہ دیا۔ لیکن میں اس پر اتنا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ کسی شعر کے بار بار پڑھنے سے صرف اس کی زبان کا ذوق ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اگر اس میں کوئی حقیقت یا اخلاق، روحانی اور نظریاتی قدر بیان کی گئی ہے تو وہ بھی دل و دماغ میں رچ بس جاتی ہے اور اس سے سیرت و کردار کی تعمیر میں مدد ملتی ہے۔ چنانچہ میں محسوس کرتا ہوں کہ مرزا غالب کے بعض اشعار کا میری طبیعت اور مزاج پر غیر معمولی اثر ہوا ہے اور

انہوں نے زندگی کے بعض پہلوؤں سے متعلق میرے فکر و نظر کو ایک خاص آہنگ و رنگ بخشا ہے ۔

اگر ہر بڑے شاعر کا کلام اُس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے ، تو کلام غالب کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ ماننا بڑے کا کہ غالب کے مزاج میں قلندری ، وابستگی اور بے نیازی کامل درجہ کی تھی ۔ خدا پر اُن کا اعتقاد پختہ تھا ۔ خدا کے ساتھ غایت تعلق اور اُس پر کامل بھروسہ اور اعتماد کے باعث ان میں خودداری اور عزت نفس کا احساس اس درجہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ کسی کو نظر میں نہیں لاتے تھے ۔ چنانچہ ذیل کے اشعار ملاحظہ فرمائیے ۔ ان میں شاعر کے اس کردار کی جھلکیاں نظر آتی ہیں :

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اُس کے ہیں ہارا ہو چھٹا کیا

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا ۔ ہزا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبین ہیں کہ ہم
اُلٹے بھر آئے ، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے سرا یہ جامِ سفال اچھا ہے

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سرین کے کیوں بوجھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

یہ صرف چند اشعار بطور نمونہ کے پیش کیے گئے ہیں۔
ورنہ غالب کا اردو اور فارسی کلام اس قسم کے مضامین
سے بھرا ہوا ہے۔ مجھے مرزا کے ساتھ عقیدت اور ارادت ہیں
سے رہی ہے اور میں ان کا کلام اپنی زندگی کے اس دور سے گنگنا
گنگنا اور مزے لے کر پڑھتا آیا ہوں جب کہ میں کلام کے
معنی و مطلب اور اس کی خوبی و بلندی کو پورے طور پر
سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مندرجہ بالا اشعار اور ان کے
ہم معنی اور شعر خاص طور پر وردِ زبان رہتے تھے۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ میری طبیعت میں بھی توکل علی اللہ اور ارباب دنیا کی
طرف سے استغنا اور بے نیازی کا مادہ پیدا ہو گیا اور میں نے
دیکھا ہے کہ قدرت نے ہر موقع پر میری اس خاص افتاد طبع
کی لاج بھی رکھی ہے۔ واقعات تو اور بھی ہیں لیکن میں یہاں
مزید گنجائش نہ ہونے کے باعث صرف دو واقعے بیان
کروں گا :

پہلا واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۳۶ع میں دہلی یونیورسٹی سے
فرسٹ ڈویژن میں عربی میں ایم۔ اے۔ کرنے کے بعد میں
نے الہ آباد یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں الگ
الگ لکچرر کی ایک پوسٹ کے لیے درخواست بھیجی تھی۔

لیکن اس کا حشر یہ ہوا کہ ناکامی ہوئی اور جن اسباب کے تحت ناکامی ہوئی تھی اس کا طبیعت پر بہت برا اثر ہوا۔ میں نے خدا کا نام لے کر عہد کر لیا کہ اب میں کبھی کسی پوسٹ کے لیے درخواست نہ دوں گا۔ خدا کی شان ہے کہ میں اب تک اس عہد پر قائم ہوں۔ اس درمیان میں سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں لکچرار رہا۔ دلی یونیورسٹی میں پہلے عربی میں ریڈر اور پھر صدر شعبہ عربی، فارسی اور اردو بنا۔ کلکتہ مدرسہ کلکتہ کا پرنسپل مقرر ہوا اور اب آج کل علی گڑھ میں ہوں۔ یہ سب جگہیں پیش کش سے ملی تھیں اور کہیں درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اس سلسلے میں میرا سینٹ اسٹیفنس کالج میں جو تقرر ہوا ہے اس کا واقعہ بہت عجیب اور شنیف ہے۔ ہوا یہ کہ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں میں نے عارضی طور پر چھ ماہ کے لیے لکچرار کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ لیکن جب ۱۹۴۰ء کے آخر میں اس پوسٹ کا اعلان نکلا تو میں نے اس کے لیے درخواست نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک صاحب کا جو پنجاب سے تعلق رکھتے تھے تقرر ہو گیا۔ جب ایک برس پورا ہو گیا اور اب ان صاحب کے تقرر کا وقت آیا تو کالج کے پرنسپل مسٹر این۔ کے۔ مین نے ڈاکٹر سید انظر علی صدر شعبہ سے موصوف کے کام کے بارے میں رپورٹ طلب کی۔

رپورٹ اچھی نہیں تھی۔ اس بنا پر موصوف کو ایک برس کے بعد جواب دے دیا گیا اور اب پوسٹ پھر یعنی ۱۹۴۲ء میں مشتھر ہوئی۔ حالانکہ یہ زمانہ میرے لیے معاشی مشکلات کا تھا۔ لیکن بعض دوستوں اور بزرگوں کے شدید اصرار کے باوجود اس سرتیبہ بھی میں نے درخواست نہیں دی اور اس کا جو انجام ہونا تھا وہ ہوا۔ امیدواروں کا انٹرویو ہوا اور ایک صاحب جو ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ تھے اُن کا انتخاب بھی ہو گیا۔ لیکن جب پرنسپل صاحب تقرر نامہ ڈرافٹ کرنے کے لیے بیٹھے تو انہوں نے چہرہ اسی بھیج کر ڈاکٹر سید اظہر علی صاحب کو بلایا اور جب وہ آ گئے تو اُن سے بولے ”ڈاکٹر صاحب! اس امیدوار کا تقرر حسب قائدہ ابھی ایک سال کے لیے آزمائشی (Probationary) ہوگا نا!“ ڈاکٹر صاحب نے کہا ”جی ہاں! قائدہ تو یہی ہے“ ”لیکن اگر ان کا کام بھی اطمینان بخش نہ ہوا تو پھر“ پرنسپل صاحب بولے ”تو انہیں الگ کر کے پوسٹ پھر مشتھر کیجئے گا“ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ ”اس طرح تو ڈاکٹر صاحب! ہمارا کالج بدنام ہو جائے گا۔ لوگ کہیں گے انہیں ڈھنگ کا آدمی ملتا ہی نہیں ہے۔ پوسٹ پر برس مشتھر ہوتی ہے“ پرنسپل صاحب نے ہنک کر فرمایا۔ اب ڈاکٹر صاحب نے یہ سنا تو بولے ”جناب! میں آپ سے چلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر

کہتا ہوں کہ اگر آپ کو ایک ایسا شخص درکار ہے ، جو ایم ۔ اے ۔ اور آنرز کی کلاموں کو ہر پرچہ ، تسلی بخش طریقہ پر پڑھا دے اور پھر وہ عربی ، فارسی اور اردو زبانوں میں اعلیٰ قابلیت رکھتا ہو تو وہ سعید احمد اکبر آبادی ہے ۔ آپ اسے بلا لیجیے ” پرنسپل صاحب یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے ” اچھا تو پھر ان کو ہی بلائیے ۔ لیکن آپ خود جالیے اور انہیں لے کر آئیے۔“ چنانچہ نومبر ۱۹۴۲ع کی ایک صبح تھی کہ ڈاکٹر صاحب میرے مکان پر آئے اور پرنسپل صاحب کا پیغام پہنچایا ۔ میں نے اسے قبول کر لیا ۔ کالج پہنچا تو پرنسپل صاحب نے مختصر شفقت آمیز گفتگو کے بعد مقرر نامہ میرے حوالے کیا ۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ایما پر ۱۹۴۸ع کے اواخر میں حکومت مغربی بنگال نے مجھ کو پرنسپل کلکتہ مدرسہ کے عہدہ کی پیش کش کی ۔ میں نے اسے قبول کر کے ۲ فروری ۱۹۴۹ع کو اس کا چارج لے لیا ۔ دو برس بعد جب میں نے حکومت کو استقلال کے لیے لکھا تو حکومت نے ایک خاص دفعہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ جب تک بنگالی زبان کا مقررہ امتحان پاس نہیں کر لوں گا میں مستقل نہیں ہو سکوں گا اور واقعہ ہے بھی میں ۔ دوسرے کالجوں میں لوگ ہندو ہندو ہیں۔ ہنس سے ہڑے تھے اور

بعض اس شرط کو پورا نہ کرنے کے باعث مستقل نہیں ہو سکے تھے۔ لیکن میں نے الحجام سے بے پروا ہو کر گورنمنٹ کو صاف لکھ دیا کہ یہ امتحان پاس کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ اس لیے گورنمنٹ کو چاہیے مجھ کو اس شرط سے مستثنیٰ قرار دے کر مجھے مستقل (Confirmed) کر دے ورنہ میرے اس خط کو استعفا سمجھا جائے۔ بزرگوں اور دوستوں کو میرے اس خط کی اطلاع ہوئی تو وہ سخت مایوس اور رنجیدہ ہوئے۔ انہیں یقین تھا کہ استثنیٰ نہیں ہوگا اور مجھے الگ ہونا ہوگا۔ میں بہر حال اپنی جگہ مطمئن تھا کہ ”مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں“ اس سلسلہ میں گورنمنٹ سے کافی خط و کتابت اور زبانی بات چیت بھی رہی لیکن میں اپنی بات پر جا رہا۔ آخر کلکتہ کے تمام کالجوں میں حیرت و استعجاب کی لہر دوڑ گئی۔ جب گورنمنٹ کا یہ آرڈر شائع ہوا کہ ”سعید احمد اکبر آبادی کو بالکل خصوصی طور پر ہنگامہ کے امتحان سے مستثنیٰ قرار دے کر پراسیل کلکتہ مقرر کیا جاتا ہے اور یہ استثنیٰ کسی کے لیے نظیر نہ ہوگا“

اس میں شبہ نہیں کہ طبیعت کی اس اتنااد میں مذہب کی تعلیمات ایک خاص ماحول میں تربیت اور اردو و فارسی کے دوسرے شعرا خصوصاً علامہ اقبال کے کلام کا بھی بڑا دخل

ہے ۔ لیکن میں غالب کو اس زمانہ سے پڑھتا رہا ہوں جب کہ میں قرآن و حدیث سے بھی آشنا نہیں تھا اور اقبال کے کلام کو سمجھ نہیں سکتا تھا ۔ اس بنا پر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ غالب کے اشعار جو سراسر زندگی کے حقائق کے ترجمان ہیں ان کا بھی زندگی سے اور اس کے مسائل سے متعلق ایک خاص نقطہ نظر کے متعین کرنے میں بڑی حد تک دخل ہے ۔ آج بھی اگر کوئی پریشانی ہوتی یا غم سے سابقہ پڑتا ہے اور میں غالب کا یہ شعر :

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پاؤے کیوں

پڑھتا ہوں تو سکون سا ہو جاتا ہے ۔

اسی طرح کبھی کشمکش حیات کی کوئی الجھن سر پر سوار ہوئی اور کسی معاملہ کا صرف ایک رخ سامنے ہونے کی وجہ سے دلکرتگی محسوس ہوتی ہے تو مندرجہ ذیل شعر سے دل کی یہ گرہ کھل جاتی ہے :

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
لہ ہو مرنا تو جینے کا سزا کیا

بہر حال حزن و الم ، محرومی و ناکامی ، طلب و جستجو اور امید و یقین کی کوئی کیفیت ہو ۔ غالب کے اشعار سے آج بھی حوصلہ اور ولولہ ملتا ہے ۔ اسی لیے غالب کا

کلام مجلس احباب میں صرف گرمی پیدا کرنے کا سامان نہیں
 بلکہ وہ مصافحہ ہستی میں ایک بانک درا بھی ہے اور روشنی
 کا مینار بھی !

ڈاکٹر محمد باقر

میرے ذہن میں غالب کی کوئی معین تصویر نہیں جس کے متعلق میں یہ کہہ سکوں کہ غالب کے فقط اس روپ نے مجھے متاثر کیا ہے ۔ مجھے غالب نے عمر کے مختلف ادوار میں اور مخصوص معاشرتی اور نفسیاتی حالات میں مختلف طور پر متاثر کیا ہے ۔ اس کی تصریر کے رنگ ، شالیے ، سائے ، اور پس منظر اور پیش منظر ہمیشہ بدلتے رہے ہیں ۔ میں اس قسم کا متوکل انسان ہوں جس نے بارہا شکست کھانے اور تسلیم کرنے کے باوجود ذہنی طور پر شکست آمادی کو نہیں اٹھایا اور اللہ کے بھروسے پر نیک فیتی ہے اپنے مقاصد حیات کی پیشرفت پر اصرار کیا ہے ، لیکن قنوطیت پسند نہ ہونے کے باوجود ان مراحل سے گذرنا پڑا ہے ۔ جہاں کبھی کبھی تھک ہار کر غالب کی یہ بات پسند آتی ہے :

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

ہدف و مقصود کی کمیابی اور ناپائی کے دوران کبھی

کبھی آرزو مندی اور تساہل کی یہ کیفیت بھی طاری ہوئی ہے :

مالکے ہے بھر کسی کو لب بام پر ہوس
سرے سے تیز دشمنہ مڑگان کیے ہوئے

دنیا کے مختلف ممالک کی سیاحت کے زمانے میں حسین مناظر کو دیکھ کر غالب کی منظر نگاری اکثر یاد آتی ہے :

اہاکہ فصل چارست و گل بہ صحن چمن
کشادہ روی تر از شاہدان بازار ست

اور پھر غور و فکر کی دنیا جب بھی آباد ہوئی ہے
عزم و عمل کی کشمکش کا سلسلہ چلا ہے تو :
ہے ہرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
کہہ کو ذہن نے غالب کے اس فلسفے کو اپنایا ہے :
ہے کہاں ممنا کا دوسرا قدم یا رب ا
ہم نے بزم اسکاں کو ایک نقش پا پایا

علمی ماحول میں اپنی بے بضاعتی کے ساتھ کام کرتے ہوئے جب جہاں غالب کو اپنی تالیف ”قاطع برہان“ کی مدافعت میں ”تیغ دو دستی“ سے جہاد کرتے دیکھا ہے تو اپنے مطعون ہونے کے زمانے میں غالب کی یاد سے بڑی تسکین اور راحت محسوس ہوئی ہے :

نہ سرو بزرگ ستائش ، نہ دماغ نفیریں

”سیاست کلام“ اگر کوئی علم ہے تو غالب کی اس
تلقین نے ہمیشہ راہنمائی کی ہے :

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات اس نے شکایت ضروری

غرض غالب ”صد رنگ“ اور ”ہزار شیوہ“ نے ہمیشہ
مجھ سے یہ کہلوایا ہے :

جوہر ہر ذرہ ، از خاکم ، شہید شیوہ ایست
وای من ، کز خود شہار کشتگانش کردہ ام

(غالب)

سید وقار عظیم

غالب سے میری ذہنی وابستگی اور جذباتی شیفتگی کا آغاز کب اور کیونکر ہوا ؟ یہ سوال شعوری طور پر میرے سامنے ، آج سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور آج سے پہلے یادوں کے ان بے شمار چراغوں نے جو آج جھلملاتے ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں ، اس چراغوں کی صورت اختیار نہیں کی تھی جو اس وقت میرے سینے میں روشن ہے ۔

پہلی یاد اب سے کوئی ۵۴ سال پہلے کی ہے ۔ میں آنکھوں جماعت کا طالب علم تھا ۔ اردو کی جو کتاب داخل نصاب تھی ، اس کے حصہ لفظ میں سیر ، درد ، غالب اور حالی کی دو دو تین غزلیں ، مثنویوں میں میر حسین اور نسیم کی مثنویوں کے علاوہ غالب کی مثنوی ”آموں کی تعریف میں“ کا ایک ٹکڑا شامل تھا جو اس شعر سے شروع ہوتا تھا :

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخل رطب فشان ہو جائے

حصہ نثر میں سرسید ، آزاد ، شبلی ، نذیر احمد اور شرر کی تصانیف کے اقتباسات کے علاوہ غالب کے تین چار خط بھی تھے۔ غالب کی جن تین غزلوں کے منتخب شعر شامل نصاب تھے ، ان کے پہلے مصرعے یہ ہیں :

۱ - کوئی امید پر نہیں آئی

۲ - ابن مریم ہوا کرے کوئی

۳ - نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا -

استعان سے کچھ دن پہلے جب نصاب ختم ہوا تو مجھے اپنے ادب کے کئی اکابر کے نام یاد ہو چکے تھے لیکن جو نام سب سے زیادہ یاد تھا وہ غالب کا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بغیر کسی کوشش کے غالب کے کئی شعر زبانی یاد ہو گئے تھے ، دوسری وجہ آسوں کی تعریف میں کہے ہوئے وہ شعر جنہیں بڑھتے وقت ان طرح طرح کے آسوں کا ذائقہ تازہ ہوتا رہتا تھا، جن کا گہوارہ اودھ کی وہ سرزمین ہے جو باغ جنت کے لیے بھی باعث صد رشک ہے۔ نثاروں اور شاعروں کے ان بڑے بڑے ناموں میں سے صرف غالب کے نام کا میرے ذہن کی کمرائیوں میں جگہ بنا لینے کی ایک وجہ غالب کی آسوں سے گہری رغبت کے وہ لطیفے تھے جو ہمارے اردو کے مولوی صاحب نے ”ہارے آسوں کا کچھ بیان ہو جائے“

پڑھائے وقت ہماری ہنسی اور ہماری خوشی میں شریک ہو کر ہمیں سنائے تھے۔ آٹھویں جماعت کے نصاب کے خاتمے کے بعد جو غالب مجھے کوئی واضح احساس دلانے بغیر چھکے سے میری شناسائی اور آشنائی کے حلقے میں داخل ہو گیا تھا، وہ ایک شاعر تھا جس کے کچھ شعر مجھے زبانی یاد تھے اور کچھ مولوی صاحب کی انتہائی کوشش کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آئے تھے، وہ ایسا شاعر تھا جس نے آموں کی تعریف میں بڑے خوبصورت شعر کہہ کر میری پسند کے پھل کو اپنی پسند کا پھل کہا تھا، وہ ایسا انسان تھا جو آم حاصل کرنے کے لیے بادشاہوں تک سے ہنسی مذاق کی باتیں کر سکتا تھا۔

اس کے بعد کے دو تین برسوں میں بڑی تیزی سے کئی باتیں ہوئیں اور غالب کا ملا جلا شاعرانہ اور انسانی وجود میرے ذہنی وجود میں سے نکل کر میرے جذباتی وجود میں سما رہا۔ گھر میں، باس بڑوس میں اور چھوٹی بڑی تقریبوں میں بچنے والے گراموفون ریکارڈ دل نشین دھنوں میں غالب کی غزلیں سنا سنا کر اس احساس میں یقین کا رنگ بھرتے رہے کہ غالب ہمارے گرد و پیش کی ساری زندگی میں سایا ہوا ہے۔

ایف۔ اے میں داخلہ ہوا اور قدم الٹا کی چھوٹی سی ہستی سے نکل کر لکھنؤ کی طرف بڑھے جو سارے ہندوستان کی ادبی اور تہذیبی زندگی کا دل تھا۔ تدریس شروع ہوئی اور

استادوں نے ادب اور زندگی کے باہمی ربط کی طرف اشارے کیے اور ادب و شعر کی ہرکھ کی کسوٹیاں سامنے رکھیں اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ یہ سب باتیں تو غالب نے مجھے پہلے سے سکھا رکھی ہیں۔ آٹھویں جماعت میں پڑھے ہوئے کسی شعر کے اچھا لگنے اور کسی شعر کے معنی سمجھ میں نہ آنے کی جو یاد اب بھی تازہ تھی اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا کہ شعر کو جانتے کے جو معیار تمہیں اب شعوری طور پر بنائے جا رہے ہیں وہ غالب کی غزلوں کے طفیل غیر شعوری طور پر تم نے پہلے سے اپنا رکھے ہیں۔ شاعر کے شعر کا اپنی ذات کے ساتھ اور اپنے معاشرے کی ذات کے ساتھ جو گہرا تعلق ہے اس کی منطقی، غالب کے خطوں، اس کے لطیفوں اور اس کی کوجہ و ہام میں گلے جانے اور خاص و عام کے دل میں اتر جانے والی غزلوں کے وسیلے سے تم تک پہنچ چکی ہے۔ غالب کے رشتے میرے قلب و ذہن کو اسیر کر لینے والی یہ پوشیدہ، غیر محسوس اور غیر شعوری منطقی ایف۔ اے اور بی۔ اے کی چار سال کی تعلیم کے دوران میں میرے لیے محسوس اور شعوری ہتی گئی۔ حامد اللہ افسر، مولوی محمد حسین اور سید مسعود حسین رضوی جیسے استادوں کی ادبی اور شعری بصیرت، ان کی تصانیف جو غالب کے اشعار کی تشریح و تفسیر و تعبیر کو ادب کے ذہنی مسائل

کا وسیلہ بنتی تھیں ، مرزا محمد عسکری کی ادبی خطوط غالب ، بے خود موبانی اور آسی لکھنوی اور اثر لکھنوی جیسے شاعرین غالب کے خیالات پر بحثوں کی گرم بازاری ، نگار کے خاص نمبر ، غالب کی زمینوں میں کبھی جانے والی طرحی غزلوں کے مشاعرے ، چار ہانچ سال تک لکھنؤ میں رہ کر مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ جیسے ہماری شاعری میں غالب ہی سب کچھ ہے اور اس کا دیوان غزلیات ہماری افرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے خارجی اور داخلی تجربوں کا عطر ہے۔

یہی زمانہ ہے جب مضامین رشید پڑھے اور اندازہ ہوا کہ اس عظیم مزاح نگار اور طنز نگار کی عظمت میں غالب کا فیضیان اثر کس حد تک کارفرما ہے۔ یہی دور ہے جب علی عباس حسینی ، ل۔ احمد اکبر آبادی ، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھ پوری کے افسانوں نے ادب کی اس مقبول صنف کو عروج بخشا تھا۔ لیکن ان کے افسانوں کے عنوان دیکھ کر ان کے افسانوں میں آنے والے مکالمے پڑھ کر اور ان کے اسالیب کی خوش ترکیبوں پر نظر ڈال کر یہ رائے اور زیادہ پختہ ہو گئی اور اب دیوان غالب میرے لیے حرز جان بن گیا۔

ایم۔ اے کے نصاب میں غالب کی غزلیں بھی تھیں اور ان کے خط بھی۔ اب غالب کو اور قریب سے دیکھا اور میری تنقید نگاری کی ابتدا جن دو مضمونوں سے ہوئی وہ دونوں

غالب کے زیر بار احسان ہیں۔ ایک مضمون تھا ”شعر میں سادگی“ اور دوسرا ”اردو کا پہلا نقاد“۔ پہلے مضمون کے خیالات کا سر چشمہ غالب کے شعر تھے اور دوسرے کی بنیاد تنقید کے وہ اصولی نکتے جو اردو نثر میں سب سے پہلے غالب کے خطوں کے وسیلے سے ہم تک پہنچے ہیں۔

غالب مجھے سب شاعروں اور سب نثاروں سے زیادہ عزیز ہے کہ مجھ میں جو تھوڑا بہت تنقیدی شعور ہے وہ اسی کا عطا کیا ہوا ہے۔ اتفاقات اور حادثات نے غالب کو مجھ سے چھین لیا۔ کس سے کہوں کہ یہ علم میری زندگی کا کتنا بڑا غم ہے ؟

ن - م - راشد

پروفیسر بخاری مرحوم کی نظر سے مشہور افسانہ نگار
محمد حسن صاحب عسکری کے بعض ”نقیدی“ مضامین گزرے۔
بے ساختہ ہنکار اٹھے۔ ”یوں معلوم ہوتا ہے جیسے عسکری
صاحب ان فرانسیسی ادیبوں کے ساتھ رات بھر قاش کھیلتے
رہے ہوں!“

آپ نے غالب کے بارے میں ”ذاتی اور انفرادی“ تاثرات
پر مضمون کا مطالبہ کیا ہے اور میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں
یہ مضمون بھی غالب کے ساتھ بے جا بے تکلفی ہو کر نہ رہ
جائے۔ تاہم آپ نے اچھا کیا کہ ایک ہزار الفاظ کی قید لگا دی۔
شاید اسی بہانے قلم سے کوئی کام کی بات نکل جائے!

غالب سے اس نیاز مند کا تعارف اس وقت ہوا جب میں
لوہی جامعہ میں تعلیم پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ (آج کل کے
طالب علم تو اس سے بھی بہت پہلے غالب حفظ کر لیتے ہیں!)
ایک ہم جامعہ جن کے ساتھ روز کا اٹھنا بیٹھنا تھا غالب کے
اشعار کا دن رات ورد کرتے رہتے تھے۔ انہی کو حیرت میں

ڈالنے کے لیے خود بھی غالب کے بیسیویں اشعار یاد کر ڈالے ۔
 لیکن صحیح بات یہ ہے کہ میں اب تک غالب کو محض ”ناظرے“
 ہی پڑھ سکتا تھا ۔ (آج کل کے طالب علم شاید سمجھیں ہیں سے
 غالب کے مطالب کی گہرائیوں تک جا پہنچتے ہوں !) ۔
 پھر حال جان کاہی اور جان کنی کا وقت لب آیا جب گورنمنٹ
 کالج لاہور میں مولوی کریم بخش صاحب مرحوم کے سامنے
 غالب کو سمجھنے کے لیے مجبوراً ڈانٹے قلمذتہ کرنا پڑا ۔
 مولوی صاحب آردو کے جید عالم مشہور تھے ۔ لیکن—یا
 شاید اسی وجہ سے—وہ شاعری اور شاعروں کے نہایت مخلص
 دشمنوں میں سے تھے ۔ اور بیچارے غالب سے تو انہیں خاص
 طور پر چڑ تھی ۔ مولوی صاحب صرف طوعاً و کرہاً غالب
 پڑھاتے تھے ۔ جب کہیں غالب کا کوئی ”نہایت عاشقانہ شعر“
 آ جاتا تو کچھ شرما جاتے ۔ کچھ بوکھلا اٹھتے اور آخر کتاب
 پھینک گھر کی راہ لیتے اور ہم ان کے لطف و عنایت کے ان
 لمحوں کو غنیمت شمار کرتے ۔ کبھی ہم میں سے
 کوئی کسی شعر کا مطلب پوچھنے کے لیے ان کا پیچھا کرتا
 تو ہاتھ جھٹک کر کہتے ”چلو جاؤ ۔ مجھ سے یہ لغو
 شاعری نہیں پڑھائی جاتی“ ۔ لہذا ہمیں اپنی تربیت کی صورت
 نکالنی پڑی ۔ غالب کی تمام شرحیں خریدیں اور ایک ایک
 کر کے پڑھ ڈالیں ۔ خدا بھلا کرے نظامی بدایونی کی شرح ،

حسرت سوبانی کی ، سہا خیر آبادی کی ، بے خود کی ، اُسی لکھنوی کی ۔ اب غالب کچھ کچھ ہلے پڑنے لگا ۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ شرحیں بھی محض وہ کثرت تعبیر کیوں ہیں جو اس خواب پریشان کو پریشان تر کر رہی ہیں ؟

ہے کہاں مٹنا کا دوسرا قدم یارب !
ہم نے دشتِ اسکان کو ایک نقشِ پا پایا

شارح کی زبان میں :

”شاعر کہتا ہے ، کہ اے میری مٹنا ۔ یعنی جانِ مٹنا ۔
یعنی محبوبہ جب یہ دشتِ اسکان یعنی ربعِ مسکون یعنی
دلیا تیرا ایک ہی قدم یعنی پالوں ہے تو“

معلوم ہوا کہ غالب کو شعر کہنا نہیں آتا تھا ! بہت دنوں تک کسی شرح کو ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں بڑی ۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے عزیز دوست ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے صرف ”بانگ درا“ کی شرح لکھنے پر اکتفا کی ہے ۔ جب بجنوری ہاتھ لگا ، (مرحوم نے دو تین نظمیں کسی بیماری لکھی تھیں !) تو آنکھیں روشن ہو گئیں ۔ مشرق و مغرب کا یہ علم اور کہاں ملے گا ؟ نثر میں یہ قصیدہ خواقی کسے نصیب ہوئی ہو گی ؟ سخن فہمی کے جانے اتنا عشق کسی شاعر سے کس نے کیا ہو گا ؟ جب ڈاکٹر لطیف کی انگریزی کتاب ”غالب“ ملی ، تو اندازہ ہوا کہ ایپرکرومی

نے جو عظیم شاعری کی تعریف کی تھی۔ اس پر بیچارہ غالب پورا نہیں آکرا اور افسوس ہوا کہ ایئر کرومبی صاحب غالب سے پہلے دلی میں کیوں نہیں پیدا ہوئے؟ پھر حال ایسا بھی کیا شاعر جو مغربی شاعروں سے اتنا گھٹیا ہو۔ (ایک ہی حیدر آباد سے دو متضاد آوازیں بلند ہوئیں تھیں!) اسی زمانے کے لگ بھگ نیاز فتحپوری لکھ رہے تھے کہ غالب کی چوریاں پکڑی گئی ہیں اور بادش بخیر مرزا یاس یگانہ چنگیزی نے تو غالب کو آکھاڑے میں اترنے کی دعوت دے رکھی تھی۔ سوچا۔ غالب عظیم شاعر ہو یا نہ ہو۔ چور شاعر ہو یا نہ ہو اور مرزا یاس یگانہ کے مقابلے میں جم سکے یا نہ جم سکے۔ لیکن یہ کیا مصیبت ہے کہ ہر جگہ یوم غالب منانے جا رہے ہیں۔ لوگ اس کی شرحوں پر شرحیں لکھ رہے ہیں۔ مصور اس کے شعروں کی تصویریں بنا رہے ہیں۔ کالج کی اعلیٰ جماعتوں میں مولوی کریم بخش صاحب کے ہاوجود غالب پڑھایا جا رہا ہے۔ لوگوں کو اس کے سینکڑوں شعر از ہر ہیں۔ یہ سوچتا تھا کہ الہام ہوا۔ ”اردو ادبیات پر غالب کے اثرات“ پر تحقیق کرنی چاہیے۔ جب یہ مضمون مکمل ہوا تو یوم غالب پر پڑھا گیا، سر عبدالقادر کی صدارت میں اور ”ادبی دلیا“ میں چھپا۔ اس پر اپنی عمر میں سب سے پہلا معاوضہ ملا۔ پورے پانچ روپے! غالب کی قدر دل میں بڑھ گئی۔

یہ مضمون آج طفلانہ معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن خاصا طویل تھا ۔ ”ادبی دنیا“ کے پرانے سائز کے دس بارہ صفحے ۔ پھر اختر شیرانی کے ہاں سے غالب کے فارسی کے کلیات کا ایک پرانا نسخہ چرا کر پڑھا ۔ حتیٰ کہ چوری پکڑی گئی اور مال واپس کرنا پڑا ۔ لیکن اسے پڑھ کر ہتہ چلا کہ غالب کا اردو کلام جو خود اسے پسند نہ تھا ۔ اور فارسی کلام میں جو تازگی ہے وہ آدمی کو زندہ کر دیتی ہے لیکن اس طرح نہیں جس طرح عشق نے خود غالب کو لکھا کر دیا تھا اور ”نظم و نثر مولانا ظہوری“ نے خود غالب کو زندہ کر رکھا تھا ۔ غالب کے خطوط اسی زمانے میں پڑھے ۔ بلکہ ان کا وہ لطیف آیا کہ ان کی پروڈی لکھ کر ”راوی“ میں شائع کی ۔ (بے چارے شوکت تھانوی کو یہ حسرت رہی کہ غالب کے خطوط کی پروڈی کا خیال انہیں جلد تر کیوں نہیں سوچا !) اس کے باوجود ”مہر نیم روز“ اور ”دستنبو“ کے مطالعے سے خدا نے آج تک محفوظ رکھا ہے ۔ کیوں کہ ان کتابوں کو پڑھنا غالب کو اپنا ہم پیشہ نہیں بلکہ ”عمر بھر کا پیشہ“ بنانا ہے ۔ پھر اکثر اس عشق پر حیرت ہوتی ہے جو غالب کو مولانا ظہوری اور مرزا یزدن سے تھا ۔ لیکن اس پر کبھی رقابت محسوس نہیں ہوئی ۔ غالب کی روح کو خوش کرنے کے لیے ان دونوں بزرگوں کا کلام ابھی پڑھا ہے ۔ لیکن ان کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے ۔ وہ گورنمنٹ کالج میں

نصیب نہ ہو سکا۔ شاید اب حالات رو بصحت ہوں۔

اکر شیخ محمد اکرام صاحب اور شیخ غلام رسول صاحب سہر
کی تالیفات کے علاوہ غالب پر کوئی کام کی کتاب مل
جائے تو اس کا اتنا پتا ضرور بتائیے گا اور عبد اللہ الوریج
صاحب سے ملاقات ہو تو بعد سلام عرض کیجیے گا کہ غالب
کے انگریزی ترجمے بہت ہو چکے۔ اب کرم فرمائیے ! اور
انتظار کیجیے کہ ”فوری چاولوں“ کے موجد مرحوم عطا اللہ
خان اوزئی کے ترکے کی خطیر رقم سے امریکہ میں کس قسم کا
ترجمہ ایجاد ہوتا ہے !

میں سوچتا ہوں کہ اگر اردو شاعری کو غالب نصیب نہ ہوتا تو خود میرے شعر و فن پر کتنا بڑا المیہ گزر جاتا۔ میری پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جہاں معتقدات کی پرواز، زیادہ سے زیادہ تصوف کی ایک نہایت محدود دنیا تک ممکن تھی۔ مجھے میں وہ جو گریڈ اور جستجو کا جذبہ ہوتا ہے، وہ ایسے ماحول میں اول تو دب کر مر جاتا ہے، اور اگر اپنی شدت کی برکت سے زندہ رہتا بھی ہے تو اپنا تخلیقی رخ بدل لیتا ہے۔ اس عالم میں جب میرے ذہن میں ”آخر کیوں؟“ اور آخر کیسے؟“ کے سے تخلیقی سوالات شرک اور کفر کے خوف سے دہنے لگے تھے اور میں مابعد الطبیعیاتی تاویلوں میں اپنی تلاش و جستجو کے لیے پناہ گاہیں تراشنے لگا تھا، غالب سے عرض اتفاقاً میرا تعارف ہوا اور میرا تخلیقی وجود، جس پر شکست و انفعال کا غبار جننے لگا تھا، ایک پھریری لے کر تازہ دم ہو گیا۔ ”تفسیر حقانی“ کے درس کے دوران مجھے سمجھایا جا رہا تھا کہ انسانی عقل کا مقدر نارسائی ہے اور کائنات کی حقیقت اولیٰ کا ادراک ناممکن ہے۔ انسانی عقل کی رسائی

کی آخری منزل حیرت ہے جیسا کہ غالب نے کہا ہے کہ :

جب کہ مجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اور بڑی چہرہ لوگوں اور زلف عنبریں کے شکنوں
والے شعروں کو گول کر کے فوراً بعد یہ شعر پڑھا گیا :

سبزہ و کل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ، ہوا کیا ہے

درس ختم ہوا تو میں نے سوچا کہ واقعی یہ سب کیا ہے؟
اس کے ساتھ ہی دینی معتقدات اور مروجہ حالات کے درمیان
مجھے بعض ایسے تضادات نظر آئے جن کی نوعیت سطحی تھی
مگر جن کے ادراک نے ایک حساس مجھے کو بے چین کر دیا ۔
یہ شاید ۱۹۲۹ء - ۱۹۳۰ء کا ذکر ہے ۔ چنانچہ میں نے دیوان
غالب حاصل کیا اور اگرچہ بہت کم اشعار کے مفہوم تک
مجھے رسائی حاصل ہوئی مگر جو اشعار میری سمجھ میں آ گئے
انہوں نے مجھے ایک نہایت لذیذ ، پیچان سے آشنا کیا ۔ غالب
سے متاثر ہونے کی یہ بنیاد اتنی گہری اور مضبوط ثابت
ہوئی کہ آج بھی جب میں ولی سے لے کر آج تک کے اردو
شعراء پر نگاہ دوڑاتا ہوں تو غالب ، چراغوں کی ان قطاروں
میں مجھے فانوس کی طرح جگمگاتا نظر آتا ہے ۔

غالب یوں تو بے حد متنوع اور تہ دار شاعر ہے اور

اس کے ہاں تجربوں کی اتنی فراوانی ہے کہ اس کی کسی ایک ہی خصوصیت سے متاثر ہو کر رہ جانے کو میں بدذوق قرار دیتا ہوں ، البتہ غالب کی دیگر متعدد خصوصیات کے علاوہ جس خصوصیت نے میرے فکر و فن کو نمایاں طور پر متاثر کیا ہے ، وہ اس کی تعقل پسندی ہے ۔ محض تعقل پسندی نہیں بلکہ ایک شاعر کی ، ایک حسن کار کی ، ایک فن آفرین کی تعقل پسندی — غالب کی اس خصوصیت نے اردو شاعری کو بھول ہونے سے بچا لیا ہے ۔

غالب کا دور سیاسی ، تہذیبی اور معاشرتی لحاظ سے ہرجان و خائشار کا دور تھا ۔ پرانی قدریں مٹ رہی تھیں اور نئی قدروں کی صورت پذیری میں دیر تھی ۔ ماضی کے عظیم الشان ایوان ریت کے گھروندوں کی طرح بیٹھ گئے تھے اور حال متلاطم اور مستقبل دھندلا تھا ۔ بالکل وہی صورت حال تھی جس کا ذکر ہمارا آج کا ادیب کرتا ہے مگر وہ اس عصری بدنظمی کے حوالے سے شعر و فن میں بھی بدنظمی کا حق مانکتا ہے ۔ غالب کا طرز عمل اس سے بالکل مختلف تھا ۔ اس نے خارجی دنیا کی بدنظمی سے نمٹنے کے لیے اپنی تخلیقی شخصیت میں داخلی نظم پیدا کیا اور یوں بھولیت کے ان عصری نقاضوں کے سامنے سپر انداز نہ ہوا جن کے دباؤ کے تحت غالب کے بیشتر معاصرین نے ہتھیار ڈال دیئے ہی میں عافیت سمجھی

اور شاعری کے سے گہرہ کشافن کو مداری کا کھیل بنا ڈالا ۔
یوں سمجھیے کہ غالب نے شاعری میں سے ادراک و دانش کو
پن ہاس نہیں دیا بلکہ ادراک و دانش اور تجربہ و مشاہدہ کی
بہٹی میں جذبہ و احساس کو لہا کر شعری تخلیق کو نئی
معنویت بخشی ۔ اسی تعقل پسندی نے غالب کی شاعری میں
ندرت و جودت پیدا کی اور اسے اس تنوع اور بوقلمونی سے
آراستہ کیا کہ اردو کا کوئی بھی شاعر غالب کے ہمہ گیر
اضطراب ، اس کے تجربوں کی وسعت اور اس کی حیرت انگیز
لکھ آرائشی کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے ۔ غالب میں جو
بے چینی ہے ، جو جستجو ہے ، حقیقت مطلق تک پہنچنے کی
لگن کی جو شدت ہے ، وہ اسی تعقل پسندی کی دین ہے ۔
غالب کو اپنے تجربوں کے اظہار کا بے پناہ حوصلہ بھی اسی
لئے حاصل ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسی وجہ سے وہ
خارج کے تلاطم کے سامنے اسد کے چراغ کو بجھنے نہیں دیتا ۔
جن تہذیبی قدروں نے اس کی شخصیت مرتب کی تھی ، ان کا
زوال اسے یقیناً رلا رلا دیتا ہے مگر وہ اس قیامت میں بھی
اپنی شخصیت کا شیرازہ بکھرنے نہیں دیتا ۔ یہ اسی داخلی نظم
کی برکت ہے جو تعقل پسندی ہی سے ممکن ہے ۔

غالب کا مطالعہ اس کے عصر کے اس منظر میں کیجیے تو
وہ اس حد تک جدید ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا ، اسے اس انتہا

تک جدید ہونے کا حوصلہ ہی کیسے ہوا جب کہ اسے اسی عصر میں زندہ رہنا تھا۔ مثبت انداز میں جدید وہی ہوتا ہے جو ماضی (اور حال) سے عدم اطمینان کا اظہار کرتا ہے مگر ماضی و حال سے روگردانی کا نتیجہ صرف ایک صورت میں ظاہر نہیں ہوتا۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک روگردانی کلیت پر منتج ہوتی ہے اور اردو شاعروں کی جدید تر نسل کے بعض افراد کا طرز فکر اس کی ایک مثال ہے۔ لابعینت اور بے معنویت کے فلسفے اسی کلیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ دوسری روگردانی کا نتیجہ اس کھوج، اس کرید کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے کہ اس بیابان شب کی کوئی انتہا بھی تو ہوگی۔ نہیں ہے اس تلاش و جستجو کا آغاز ہوتا ہے جو غالب کی شاعری میں جاری و ساری ہے۔ غالب ماضی کی قدروں کے زوال پر انسردہ ضرور ہے مگر اس بات کا بھی اسے یقین ہے کہ اب ماضی کو زندہ کرنا ممکن نہیں اور انسانی ارتقاء کا قائلہ مستقبل کی طرف گامزن ہے۔ اگر غالب کو اس حقیقت کا ادراک نہ ہوتا تو زندگی بھر بیدل کے تنج میں کون سی برائی تھی اور اسے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ :

اثر آبلہ ہے ، جادۂ صحرائے جنوں
صورت رشتہ گوہر ہے چراغان مجھ سے

غالب کی عظمت اس میں ہے کہ وہ تعقل پسند ہونے

کے باوجود شاعر ہے ، فلسفی یا مفکر نہیں ہے ۔ انسان اور اس کی زندگی ، زمین اور کائنات ، حسن اور خدا کے بارے میں وہ کسی مضبوط فکری لائحہ عمل کے مطابق غور نہیں کرتا کہ یہ طریق کار فلسفیوں کا ہے ، شاعروں کا نہیں ۔ ہوں سمجھے کہ غالب کے ہاں ایک فکری شان ہے یا ایک فکری مزاج ہے اور وہ اس فکر کا اظہار انتہائی حسن کاری اور شاعری کے جانی تقاضوں کے مکمل احترام کے ساتھ کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ انسانی میں وہی شاعر آج بھی بڑے شاعر ہیں اور ہمیشہ بڑے شاعر رہیں گے جو فکر اور جذبے کی ایک متوازن اور باہمی مربوط صورت کو پیش کرتے ہیں ۔ غالب بھی اسی لیے بڑا ہے کہ وہ مسلسل سوچتا ہے مگر شاعر کی حیثیت سے سوچتا ہے ۔ وہ کسی تجربے یا مشاہدے کے تاثر کو اپنی پوری شخصیت میں سے گزار کر اس کا اظہار کرتا ہے ۔ وہ غوطہ لگاتے ہی ڈوب نہیں جاتا بلکہ نئی معنویتوں کے موتیوں سے مٹیہاں بھر کر ابھرتا ہے ۔ وہ اتنا باشعور ، اتنا ”خبر دار“ شاعر ہے کہ حقیقت مطلق کے سوا وہ کسی چیز کو مطلق نہیں سمجھتا بلکہ مسلسل تغیر — ارتقائی تغیر پر اس کا ایمان ہے ۔ اقبال کا ایک شعر ہے جو اس کے منفرد رنگ کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے :

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم جدائے کن فیکون

اسی خیال کو غالب غزل کی سی داخلی اور موضوعی
صنف سخن میں یوں ادا کرتا ہے :

آرائشِ چال سے فارغ نہیں ہنوز
بیش نظر ہے آئینہ دالمِ نقاب میں

یہی وہ مقام ہے جہاں فکر و فن اور حسن و حلیت کی
یک جائی ، شعر مننے والے کے صرف دل یا صرف دماغ کو
متاثر نہیں کرتی بلکہ اس کی پوری شخصیت میں جھنجھٹاہٹ
سی پیدا کر دیتی ہے جیسے شعر نے اس کے ہر بنِ مو کو
ساز کی طرح چھیڑ دیا ہے ۔ غالب کی شاعری میں فکر و فن
کے اسی معجزانہ امتزاج نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے ۔

اختر حسین رائے پوری

کم عمری میں میں بھی اردو غزل کی خوبیوں سے منکر تھا۔ میرا ادبی مزاج ایسی کسی تحریر کو پسند نہ کرتا تھا جس میں کوئی کام کی بات نہ ہو۔ وقت کے ساتھ یہ نظریہ بدلتا گیا۔ جو تہذیبی ورثہ ہم تک پہنچا تھا، تغزل اس کا واضح عنصر تھا اور اس کی تخلیق میں صدیوں کا خون جگر شامل تھا۔ کیا دراصل وہ کذب و افترا کا یہی دفتر تھا جس کا ماتم مولانا حالی نے کیا اور کیا اس کی حیثیت فارسی غزل سرائی کے کرم خوردہ چربہ سے زیادہ نہ تھی؟

اس تعصب کے طلسم کو میر اور غالب نے ختم کیا۔ اگر عشقہ شاعری میں نشاط کی کیفیت کو حافظ سے بہتر کسی نے بیان نہیں کیا تو درد بھر کو میر سے بہتر کسی نے رقم نہیں کیا۔ ہر صورت زندگی نہ سراسر نشاط ہے نہ سراسر غم۔ غالب کے یہاں ان دونوں کیفیتوں کا سنگم ہے۔ انہوں نے اردو شاعری میں سوچنے کی صلاحیت پیدا کی۔ اسے ایک ایسا انداز بیان عطا کیا جو افعال و شکست کی روایتی سرگوشی سے قطعاً علیحدہ تھا۔ اثر میں انہوں نے میر امن

کے اسلوب کو اس طرح زندہ کیا کہ وہ آنے والے نثر نگاروں کے لیے چراغ راہ بن گیا۔

غالب کی شخصیت کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ انہیں مردِ نشاءِ ثانیہ RENAISSANCE MAN کہا جائے۔ مراد اس ذات سے ہے جس کی نگاہ میں ماضی و مستقبل دونوں کے جاوے ہوں اور جو اپنے کو تلاش و تجسس کے لیے وقف کر دے۔ غالب کے اجداد کا پیشہ سپہ گری ہوا کرے لیکن وہ مائیں نہ مائیں ان کا پیشہ شاعری تھا۔ تلاش معاش میں انہیں بڑی ذلت اٹھانا پڑی اور ہشن کی تلاش میں وہ اتنے ہی پریشان ہوئے جتنے اس زمانے کے سرکاری ملازم سرگرداں ہوتے ہیں۔ یہ ایں ہمہ اس بد بختی نے ان کے جوہرِ اصل کو آج نہ لگنے دیا۔ جب وہ کسی انگریز حاکم یا دیسی رئیس کی تصیدِ خوانی سے تھک چکے تو ان کے کانوں میں آوازِ غیب آتی اور وہ ماحول پر لاجول پڑھتے ہوئے کہہ اٹھتے۔

منظر اک بلندی پر اور ہم ہٹا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکان اپنا

اردو ادب میں یہ ایک نئی آواز تھی۔ اب تک کسی نے اس بلندی پر چڑھنے کا قصد نہ کیا تھا۔ یہ جرأت و ندانہ، غالب جیسا آزادہ رو اور آزاد مزاج ہی کر سکتا تھا۔ جب وہ اس بلندی پر پہنچے تو انہوں نے انسانیت کے کمال کو

ہا لیا اور ان کی نظر میں مذہب و ملت کی تمیز باقی نہ رہی ۔
اس انداز فکر کی تاب جب آج لوگ نہیں لاتے تو اس زمانہ
میں کیسے لے آئے ۔ چنانچہ خود کہتے ہیں ۔

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی و دہری

سوال یہ ہے کہ ان کے ذہن میں یہ جلا کہاں سے آئی ؟
اس میں شک نہیں کہ وہ طبعاً مفکر تھے ۔ لیکن جو علمی
سرمایہ ان کے ارد گرد تھا وہ اس رجحان کی پرورش کے لیے
کافی نہ تھا ۔ یہ ان کی نظر بینی کا ثبوت ہے کہ انہوں نے
پیدل جیسے خیال آفرین استاد کو اپنا مرشد بنایا ۔ اس میں
بہیں شک نہیں کہ دلی کالج کے اساتذہ کی صحبت نے انہیں نئے
علوم کے خطوط سے آشنا کیا ۔ اس طرح ان کی شاعری کا
خمیر تیار ہوا ۔

آج سے سو سال پہلے میرزا غالب نے تاریخ کے جس
دور اے پر اس دنیا کو خیر باد کہا اس پر برصغیر اپنی ہستی
کی تہ کو جھوکر اوپر اٹھرنے کی آرزو کرنے لگا تھا ۔ اس
افق پر ان کی شخصیت اس روشنی کی طرح تھی جو طلوع
سہرے پہلے آسمان پر بھیل جاتی ہے ۔ جائے وقت وہ اردو
نثر و نظم کو اس نکتہ پر چھوڑ گئے جہاں تقلید کے دروازہ
بند اور اجتہاد کے دروازے کھلنے لگتے ہیں ۔

اُردو کے کسی شاعر نے 'کیوں، اور 'کیا' کا اتنا استعمال نہیں کیا جتنا غالب نے۔ وہ حیرت و استعجاب سے اس کائنات کے اسرار پر غور کرتے تھے اور زہر لب یہ بھی ہوجھتے تھے کہ ان کے معاشرے کے در و دیوار کیوں گر پڑے۔ ان میں سے جو سوال ابدی ہیں ان کا جواب کسے معلوم۔ لیکن جن سوالوں کا تعلق معاشرے کی تحریک و تعبیر سے ہے آنے والی نسلوں نے انہیں دوبرایا اور ان کے جواب اپنے طریقے سے تلاش کیے۔

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہتا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

شیخ منظور الہی

احباب کی محفل میں موضوع زیر بحث یہ تھا کہ وقت
دے قدموں یوں گزر جاتا ہے کہ احساس تک نہیں ہوتا۔
لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب انسان یک لخت خوابِ گراں
سے جولکتا ہے۔ اوہ ! فلاں کام تو کر ہی نہ پائے۔ کتنے ہی
ارادے تشریف لکھیل رہ گئے۔ بہتوں کی ہستی، شوق کی بلندی
یہ غالب آگئے رہی۔

اے زفر صفت بے خبر دریا چہ ہاشی زود ہاش

اس یہ ایک دوست نے مرزا غالب کا یہ شعر پڑھا :

مشتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کہیں

عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

تو میں پھڑک اٹھا۔ یہ شعر پڑھا تو ہوگا مگر حافظے میں

محفوظ نہ تھا۔ یوں بھی اس غزل کا زبان زد عام شعر تو یہ ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال

ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اس شعر میں بھی رموز و اسرار کا خزانہ پنہاں ہے ۔ فکر و شعور انگڑائیاں لے رہے ہیں ۔ لیکن فوت فرصت ہستی ، کتنی اچھوتی ترکیب ہے اور فوت فرصت ہستی کا غم کس قدر صداقت پر مبنی ! فوت فرصت ہستی کا غم مٹے تو کیونکر ۔ جو کل تھا ۔ آج نہیں جو آج ہے کل ہو یا نہ ہو ۔ انیس و ہسدم ایک ایک کر کے اٹھ جاتے ہیں ۔ حریفان بادہ پیا ، منتشر ہو جاتے ہیں ۔ اور انسان تنہا رہ جاتا ہے ۔

، حالات بدل جاتے ہیں ۔ انسان بدل جاتا ہے ۔ برور ایام ہم وہ نہیں رہتے جو پہلے تھے ۔ وقت کا دھارا دھیرے دھیرے ان دیکھے اپنا کام کرتا رہتا ہے طبع میں جولانی نہیں رہتی ۔ غضبان شباب میں ہر حیلے ، ہر موقع ، ہر تقریب سے حظ اٹھانے کی سعی ، عزائم میں ستارے چھو لینے کی تمنا ، کچھ بھی تو باقی نہیں رہتا ۔

گزشتہ سال مجھے اس شعر کی صداقت کا احساس شدت سے ہوا ۔ جیسے کسی نے گہری نیند سے جھنجھوڑ کے کہا ہو ۔ ”آج ہمارا محبوب پاکستان بیس برس کا ہو چکا ۔“
بیس برس ! عمر رواں کا ایک گراں قدر حصہ ۔ ہمارے گذران کا ایک طویل وقفہ !

ذہنوں کے درمیان رشتہ ”بلوغت“ ، نسلوں کے درمیان حد

فاصل !

ایس برس میں ہم نے کیا کھویا کیا پایا ؟ جواب بن
 نہ پایا ۔ مگر ذہن بھی بخش دینے پر راضی نہ تھا ۔ وطن عزیز
 کے لیے کیا کیا ؟ اپنے شہر کے لیے ؟ اپنے لوگوں کے لیے ؟
 ان لوگوں کے لیے ، جن کی جد و جہد کے بغیر پاکستان کا
 حصول ممکن نہ تھا ۔

ہم اوائل شباب میں نیک مقاصد اور ارفع آدرش کی
 زاد راہ لے کے نکلتے تھے ۔ لیکن آج بھی منزل کو سوں دور
 تھی ۔ اپنی کم مائیگی ، در ماندگی اور بے بضاعتی کا احساس
 شدید تر ہو گیا ۔ جو وقت عمل میں صرف ہوتا تھا ۔ وہ
 کچ بٹھی اور فترے چست کرنے کی لذر ہو گیا ۔ ہم میں سے
 بیشتر نیک نیتوں کے اظہار پر اکتفا کر لیتے ہیں ۔ یا
 کمر ہمت ہاندھنے میں اتنا وقت صرف کر دیتے ہیں کہ ”جنگ“
 ختم ہو چکی ہے ۔ ایسے میں آپ ہی کہیں کہ فوت فرصت
 ہستی کا غم کیونکر نہ ہو ۔

اس سے قطع نظر کہ فوت فرصت ہستی کا غم کیوں
 تھا ۔ گزرے ہوئے لمحات کا غم ایک حقیقت ہے ۔ جس سے
 الحراف نہیں ہو سکتا ۔ خواہ وہ ارفع مقاصد نہ پاسکتے کی
 حسرت ہی کیوں نہ ہو ۔

دیکھ کس پیار سے انوار سحر چومنے ہیں
 مسجد شہر کے مناروں کو

جن کی رفعت سے مجھے اپنی برسوں کی ممنا کا خیال آتا ہے ۔ اور وہ ازلی کشمکش ! ایمان مجھے روکے ہے ۔ تو کھینچے ہے مجھے کفر ۔ انسان فرشتہ تو نہیں ۔

”نا کردہ گناہوں کی حسرت“ ابھی کبھی دل پر شنجوں مارتی تھی ۔ تصور گناہ ۔ اور اس کے ساتھ مسلسل نبرد آزمائی میں جو لطف تھا ، وہ شاید ارتکابِ گناہ میں بھی نہ ہوتا ۔ مانا کہ وہ تصور دیر پا نہ تھا ۔ ہوا کا جھولکا ، سطح آب پر لطیف نقش بنائے یا طوفانی تھپیڑا سنیہ دریا تہہ و بالا کر ڈالے ، بالآخر نقش بر آب ہے اور گزشتی ۔ ہم نے سوچا تھا کہ اس کا اثر پائندہ نہیں ۔ اس بحرِ فلام سے یوں ابھرنے تھے جیسے کبھی ڈوبے ہی نہ تھے ۔ جیسے گناہ کے اندھیارے نے زندگی کے اجالوں کو چھوا تک نہیں ۔ ہمارے زعم میں ہماری معصومیت برقرار رہی ۔ (یہ خود فریبی تھی) ۔ ہمیں جرأتِ گناہ پر تعجب بھی ہوا تھا ۔ احساسِ گناہ کے بے پناہ ریلے ہمیں دبوچتے تھے ۔ اور ہم ہر گاہ کی طرح اُس مدد و جزر کے ساتھ ابھرنے ڈوبتے تھے ۔ نا کردہ گناہ !

ایک رطلی گراں ، ایک عظیم عشق ، ایک لمحہ عالیہ
ہا لینے کی حسرت !

وہ دن بھی گزر گئے ۔ اُن لمحوں کو آواز دینا چاہیں گے تو صدا گلوگیر ہو کے رہ جائے گی ۔

فروری ۱۹۶۸ء میں والد ہم سے جدا ہو گئے ۔

میں اس سوچ میں پڑ گیا کہ اس شعر کا اطلاق والد مرحوم کی زندگی پر بھی ہوتا ہے ۔ انہوں نے بھرپور زندگی بسر کی ۔ نا امیدی اور قنوطیت کا لفظ ان کی لغت میں نہ تھا ۔ انہوں نے کبھی ہار نہ مانی تھی کوئی لمحہ فراغت کا نہ ہوتا ۔ تعلیمی سماجی اور قومی اداروں میں ان کا انہماک دیدنی تھا اور قابل رشک ! ہر حالی میں انہیں حاجت مندوں کی دل جوئی منظور تھی ۔ ان کے در سے کوئی خالی ہاتھ نہ جاتا ۔ کسی کو قمارفی خط دے دیا ۔ کسی کے لیے فون کر دیا ۔ کبھی کسی اجنبی کے ساتھ خود چل کھڑے ہوئے تاکہ اس کی حق رسی ہو جائے ۔ کہتے ہیں خلق خدا کی خدمت عبادت ہے ۔ لیکن ان کا باقی وقت بھی ذکر و عبادت میں گذرتا ۔

انہیں اس بات کا احساس تھا کہ انہوں نے بھرپور زندگی بسر کی ہے ۔ جوانی میں شکار اور گھوڑے کی سواری ، دوستوں کی محفلیں ، شخصیتوں اور خاندانوں سے تعلقات ، وہ برص ہا برص پنجاب یونیورسٹی ، زراعتی یونیورسٹی ، پنجاب اسمبلی اور مغربی پاکستان اسمبلی سے منسلک رہے ۔ متعدد دفاتر اداروں سے متعلق ہونے کے علاوہ انجمن اسلامیہ لائل پور کی سربراہی انہیں ۱۹۳۵ء میں تفویض ہوئی اور دم آخر تک رہی ۔ ایک مثالی زندگی جو ہر لحاظ سے نئی نوع انسان

کے لیے کار آمد تھی ۔

انہوں نے انتقال سے چند ماہ پیشتر کہا تھا کہ اب کوئی حسرت باقی نہیں رہی ، اس کے باوجود جد و جہد سے ملو زندگی گزر جانے کا ملال انہیں بھی تھا ۔ سانس پورے ہو چکے تھے ۔ وقت کی ریگِ روان شیشہٴ ساعت سے قریباً گزر چکی تھی ۔ چند ذرے باقی تھے جن میں آب و تاب اب تک قائم تھی ۔ وہ جسے زندگی سے والہانہ شغف تھا ، وہ جس کی زندگی ”حالیا غلغلہ در کعبہٴ انلاک الداز“ کی تفسیر تھی ، آخری دنوں میں گرتی ہوئی صحت کے سبب زندگی میں ان کی دلچسپی کم ہونے لگی تھی ۔ جیسے دھرا رہے ہوں ۔

مٹنا ہے فوتِ ارمیتِ حق کا غم کہیں
عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

الطاف گوھر

غالب کی شخصیت اور کلام سے میں نے کیا پایا ؟
وہ کیا ”نیا تصور یا نیا احساس“ کیا ”نیا فکری یا
جذباتی افق“ تھا جو غالب کے واسطے سے میرے لیے منور یا
منکشف ہوا ؟

غالب نے (میری) ذہنی فکری اور جذباتی زندگی کو
کس عنوان سے متاثر کیا اس سے (میں نے) کیا پایا اور ذاتی
طور پر (میرے لیے) وہ کیا معنی رکھتا ہے؟

غالب جیسے شاعر اور غالب جیسی شخصیت کے سلسلے
میں غالباً یہ مشکل ترین سوالات ہیں۔ غالب کے کسی
طالب علم، کسی ہرستار، کسی ریسرچ اسکالر اور نقاد کو
آج تک یہ ہفت غواں طے کرنے کو نہیں کہا گیا ہوگا۔

لفظ و معنی ایک نیرنگ ممنا ہیں۔ میں عمر کا ایک
بڑا حصہ اس نیرنگ ممنا کا تماشائی بھی رہا، اس کا امیر بھی۔
اس پر مشرق و مغرب کے معانی سازوں نے بہت کچھ لکھا۔
میں نے بہت کچھ پڑھا اور شعر تو نہیں نثر میں اس موضوع پر

اپنی جستجو کی کئی بار داستان لکھی ۔ ان نکتوں اور گوشوں کی داستان یا بیان جو اس بحث نے مجھ پر منکشف کیے —

سچے ہیں شروع میں ایک ”خیال“ تھا جو صوت اور حرف کی منزلوں سے گزرا تو ایک لفظ بنا ۔ اس سے کیا ظاہر کیا باطن ، پیدا و پنہاں ، ورا اور ماورا سب کچھ وجود میں آیا ۔ جب سے اب تک یہ بحث جاری ہے کہ ٹیرلنگ تمنا کی ترجمانی لفظ کرتا ہے تو لفظ کیا ہے ۔ پھر فہم اور ادراک اور عرفان جیسے انسانی کمالات ہیں ۔ اختراع ، ایجاد اور انکشاف جیسے انسانی اعزاز ہیں ۔ اور ان سب کا سہارا اور ترجمان بھی لفظ ہے ۔

تو لفظ کی چٹائی ، اس پہلے لفظ ”کن“ سے لے کر اب تک صدیوں کے انسانی کمالات پر محیط ہونے کی موجودہ منزل تک کیا ہوگی ۔

میں نے رسمی طالب علمی کے دور میں جب غالب سے ٹیرلنگ تمنا اور جوہر الدیشہ جیسے لفظ سنئے تھے تو لفظ کی اس قوت سے بے جا نے بوجھے بہت ہیبت زدہ ہوا تھا ۔ پھر مختلف عالمگیر واقعات ، مختلف عالمگیر تحریکوں ، مختلف عالمگیر انقلابات میں لفظ کی قوت دیکھی تو ہر دفعہ یہ خیال آتا رہا کہ ان قوتوں کی بے پایاں آگ سے لفظ مرنا کیوں نہیں ، مٹا کیوں نہیں جاتا ، جب کہ غالب کہتا ہے کہ جوہر الدیشہ کی گرمی سے — یہ آہکینہ بگھل جاتا ہے ۔

بکر یہ بھی غالب ہی نے سکھایا کہ لفظ کی پہنائی پر غور کرو تو تم دیکھو گے کہ ما سے سک تک سب کچھ اسی میں ہیں۔ اور اس پہنائی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کو پھیلا یا جا سکتا ہے ، سکڑا جا سکتا ہے ساکت اور جامد بھی بنایا جا سکتا ہے اور حرکت اور نمو کی وہ بھلیاں بھی اس پہنائی کی رگ رگ میں سموی جا سکتی ہیں کہ ہم نے دشت امکان کو ایک نقش پا ، پایا

چنانچہ یہ خیال نہ کرو کہ لفظ کے معنی وہی ہیں جو بقول غالب کسی ”ملائے مکتبی رام پوری“ کسی قتیل ، کسی واقف کے ہاں ہیں۔ لفظ میں معنی ڈالے جاتے ہیں ، کبھی اچھے سے کبھی خیال کی قوت سے۔ کہ غالب نے خود برا کو اچھا کے معنوں میں استعمال کر دکھایا۔ لفظ کے معنی بدلے جاسکتے ہیں۔ جو عالمگیر جنگوں ، عالمگیر تحریکوں اور عالمگیر پالیسی کے اس کواکب شکار اور آسماں گیر دور میں ہو رہا ہے اور لفظ میں معنی کبھی زندہ کبھی مردہ کر دیے جاتے ہیں کہ جیسے اب اس کا معنی کچھ نہیں اور جیسے قوت کا معنی اب پائندہ تر کیا جا رہا ہے۔

یہ وہ فکری افق ہیں جو ہر دور میں غالب کے الفاظ اور ان کا استعمال مجھ پر اور ہر طالبِ معنی کے لیے منکشف کرتے رہے ہیں۔

لفظ و معنی کے ربط باہم ، لفظ و معنی کے ظاہری رشتوں اور ان کے امکانات کا یہ سلسلہ بہت دراز ہے ۔ اس کے واسطے سے میں نے جب موقع ملا غالب کو پڑھا اور ان پر غور کیا اور ہر دفعہ مجھ پر فکر اور اظہار کے نئے افق ہویدا ہوئے ہیں ۔

پھر جینے کے فریتوں اور زندگی گزارنے کی اکھاڑ پچھاڑ کا مسئلہ ہے ۔ غالب کے ذہنی اور فکری افق کا احاطہ کرنے کے لیے تو ذہن اور فکر بھی اتنا ہی عظیم اور عریض ہونا چاہیے لیکن اپنی بساط مطابق ، میں نے ان کے کلام سے ان کی شخصیت سے اور ان کے الدار نظر سے ہمیشہ ہمت اور بے نیازی کا حوصلہ حاصل کیا ۔ وہ ہمارے جدید معنوں میں پیاسی شاعر نہیں ۔ امید ، عمل ، جوشِ کردار کے مبلغ نہیں لیکن وہ ایک ایسا ادارہ ہیں جس میں زمان اور زمان کے اندر زندگی کم ہے ۔

یوں کہنے کو وہ رُزق کی کمی کے شکوہ سنج رہے ۔ لیکن اس سے زیادہ شکوہ ان کو یہ تھا کہ لیر و شیفٹ ، صدر الدین آزرہ اور صحیفائی موجود تھی لیکن میرے الدار نظر کی پہنائی کو جاننے کے لیے یہاں کہاں سے آئی ۔ اس لیے وہ زمانے سے اتر لیتے بھی رہے اور اس سے بے نیاز بھی رہے ۔

فن زندگی (آرٹ آف لیونگ) کا اہم نکتہ ہے کہ زندگی

ہزار رنگ اور ہوا قلموں ہے۔ حافظ کے لفظوں میں ”عجوز ہزار داماد“ ہے۔ اسے اگر مہذب انسان کی طرح بسر کرنا ہے، تو تمہیں بھی ہزار شیوہ بنتا پڑے گا۔ غالب کی شخصیت نے یہی ہوا قلموں پیدا کی

دیرم ، شاعرم ، وندم ، ندیم ، شیوہ ہادارم
اور پھر جا کر یہ حوصلہ ، یہ ظرف ، یہ پہنائی ان میں آئی کہ
ولی اور کافر کی منزلوں سے آگے بڑھے۔ زندگی گزارنے کے لیے
جو حوصلہ چاہیے ، غالب سے جو بھی حاصل کرے گا اسے
ملے گا۔

ایک بات اور جس نے مجھے ہمیشہ مسحور رکھا ہے۔
ہم چاہیں نہ چاہیں زندگی کا ہر لمحہ پہلے کا قاتل بن کر
سامنے آئے گا۔ آج کی نورجہاں بیگم ، کل کی مہرالنسا کو
ضرور جھٹلائے گی۔ اور فردا کی ملکہ عالیہ ، روش کی بیگم کا
بطلان ضرور کرے گی۔ یہ بیہم شکست ، یہ ریخت ، یہ بگاڑ
اور یہ ہر آن لیا ہوا (میں قصداً تغیر اور تبدیلی کی اصطلاحات
سے گریز کر رہا ہوں) ہی ہر زوال ، ہر عبرت کی بنیاد ہے۔
اب ذرا روح کائنات سے قریب آئیے۔ تو یہی لیا بگاڑ ، ہوا ،
حرکت اور ہوا اور ارتقا کا طلسم نظر آئے گا۔ خود اپنی حدود
زندگی میں بھی دیکھا کہ ہر تغیر تبدیلی ہر بہت بنے پکڑے
مگر آخر کو یہی آج کا بگاڑ ، ہوا اور ارتقا کی خدائی مصلحت

نظر آئی - بہت پہلے غالب کے اس شعر کو سکول والوں نے
محض نثریج کا پھانہ بنایا تھا جو آج بھی ہر مرحلے پر مشعل
بن کر دمک اٹھتا ہے ۔

آرائی جال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشہ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

تبدیلی اور ارتقا غالب کی اسی حوصلہ مندی کا ایک کرشمہ
ہے جو ان کے عشق سے ، ان کے رشک دشمن سے ، ان کے
فراق و وصال سے ، ان کے نعرہ

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ ، گہرائیں کیا
ہے ہر جگہ آشکار ہے ۔ کیونکہ ہر عظیم ذہن کی یہ خاص پہچان
ہوتی ہے ۔ وہ اسی اصول کے کاربند ہوتے ہیں اور یہی وہ
سکھاتے ہیں کہ زندگی کی ہر خاک اڑاتی راہ بھی گلزار کو
جائے گی ۔

ہاں جاہد بھی قتلہ ہے ، لالہ کے داغ کا !

اور ان باتوں کے بعد پھر کلیات سامنے آتی ہیں اور اس
ذہن کے بسیط حیرت خانے کے ایک جلوے سے زبان ہر سہر
لگ جاتی ہے ۔

رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم ہستند
دل رہودند و دو چشم نگراہم دادند

ڈاکٹر محمد اجمل

چین میں اپنے گھر میں ہم غالب کو شاعری کا دیوتا سمجھتے تھے ، ہمارے گھر میں ان کے وہ تمام شعر اکثر و بیشتر استعمال ہوتے تھے ، جو زبان زد خاص و عام تھے ، گھر کی فضا میں چونکہ پارسائی اور اداسی کا رجحان زیادہ تھا ، اس لیے یہ شعر بہت پڑھا جاتا تھا :

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں !
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں !
لیکن نوشاہی کے عالم میں میں نے جب خود غالب کا مطالعہ کیا تو اردو کے اشعار سے زیادہ فارسی کے شعروں نے دل پر گہرا تاثر چھوڑا ، ایک شعر جو اس وقت میری اپنی حساسیت کی ترجمانی کرتا تھا ، مجھے اکثر یاد آتا :

تشنہ لب ہر ساحل دریا ز غیرت جان دہم
گر بوج آفتدگانِ چینِ پیشانی مرا

اور اس شعر کی وجہ سے ”چینِ پیشانی“ کا شعور مجھ میں شدید تر ہوتا گیا اور بسا اوقات اس شعور میں گان کا عنصر غالب ہوتا۔ انسانی تعلقات کے چھوٹے چھوٹے صدمے اپنی

الم لای کو اس شعر میں ڈھال دیتے اور مجھے خاصا سکون حاصل ہو جاتا ، اسی طرح کا ایک اور شعر بھی ذہن پہ خاصی مدت تک حاوی رہا :

آغشتمِ ایم پر سر خارے بخونِ دلِ
قانونِ باغبانی صحرایِ نوشتہِ ایم

جوانی ہی کے عہد میں کئی مرتبہ غالب کا کوئی شعر ، جسے میں اپنی دانت میں لراموش کر چکا ہوتا ، خود بخود زبان پر وارد ہو جاتا اور کئی بار کی تکرار کے بعد مجھے احساس ہوتا کہ میں یہ شعر پڑھ رہا ہوں ۔ ۱۹۵۰ء کی بات ہے کہ لندن میں ایک دوشیزہ سے کسی قدر دل بستگی ہو گئی ، لیکن چند معقول اور بیشتر نامعقول وجوہات کی بنا پر میں نے اس سے کنارہ کشی کرنے کا ارادہ کر لیا ، رہتے ہم ایک ہی ہوٹل میں تھے ، اس 'عزم بالجزم' کے بعد دوپہر کے کھانے پر میں نے آئے دیکھا ، لیکن کوئی بات نہ کی اور دور دور رہا ، اس نے بھی میرے تیور پہچان کر کوئی بات نہ کی ، کھانا کھانے کے بعد جب میں لائبریری کی طرف چلا ، تو خیال آیا کہ پندرہ بیس منٹ سے میں یہ شعر گنگنا رہا ہوں :

میں اور ہزم سے ہے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساق کو کیا ہوا تھا

پھر اقبال کے زیر اثر ایک دور ایسا بھی آیا جس میں غالب کے

باغیانہ اور انقلاب پسندانہ اشعار زیادہ پسند آنے لگے ، یا کہ قاعدہ آہاں بگردانیم سے لے کر بوادی کہ دران خضر را عصا حقتست اور ہوا مخالف و شب تار و بادِ طوفان خیز تک حرز جان بن گئے اور میں انہیں اکثر پڑھتا اور سر دھتا لیکن کوئی بس برس سے غالب کا جادو ٹوٹنا جا رہا ہے ۔ اب اس کی اتانیت میں خود فریبی اور خود ناشناسی کا پہلو زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے ، عشق میں سر بھوڑنا چاہتا ہے لیکن خاص اہتمام سے کہ محبوب کا سنگ آستان نہ ہو ، سوچتا محبوب ہی کے متعلق ہے ، سر بھی اسی کے لیے بھوڑتا ہے لیکن ”مرگشتی رسوم و نیرود ، اس قدر شدید ہے کہ اس مقدس فریضے کے لیے کوئی اور آستانہ ڈھونڈتا ہے گویا سر عشق کا ارمغان نہیں ، شکستہ انا کی جھنجھلاہٹ اور بے زاری ہے ، دہر و حرم کو بھی اپنی واماندگی شوق کی پناہ سمجھتا ہے ، ہر شعر میں ’الا لوازی‘ کرتا ہے ، اور التباس کو قبول کرتا ہے ، ”ہم انجمن سمجھتے ہیں ، خلوت ہی کیوں نہ ہو“ سے اس التباس ذہنی کا پتہ ملتا ہے ، خلوت غالب کے لیے انجمن نہیں ۔ آجے خلوت کو انجمن ’سمجھنا‘ پڑتا ہے ۔ التباس صحیحہ ، تو تعلیقی عمل کے لیے لازمی ہے ، لیکن غالب جا بجا التباس کاذب کا بھی شکار ہو جاتا ہے اور اس التباس کاذب کو ندرت زبان کے ذریعے دل آویز اور دل پذیر بنانا چاہتا ہے :

بیا ورید گر این جا بود زباں دانے
 غریب شہر سخنہائے کفتی دارد

یہی وجہ ہے کہ مجھے اب غالب کے مقابلے میں میر بہت
 بڑا شاعر نظر آتا ہے اور خوشی ہو یا ملال ، لذت ہو یا الم ،
 غالب پڑھنے سے وہ روحانی امتزاز حاصل نہیں ہوتا جو میر
 کے مطالعے سے ہوتا ہے ۔

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

غالب سے میری شناسائی کا آغاز کوئی تیس برس قبل ہوا جب کہ میں مرحوم ریاستِ حیدر آباد میں نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اصاب میں اردو نظم و نثر کا جو انتخاب شامل تھا وہ مولوی عبدالحق کا مرتب کردہ تھا اور مجھے خوب یاد ہے کہ اس میں غالب کی چند غزلیں تھیں جو سہل ممتنع انداز کی تھیں، چند مکاتیب تھے جو غالب نے تفتہ، مجروح اور سالک کے نام لکھے تھے، اس کے علاوہ مولانا حالی کی یادگار غالب سے وہ اقتباس بھی تھا جس میں غالب کے اخلاق کا تذکرہ ہے۔ گویا اس انتخاب میں غالب کا تعارف شاعر، نثر نگار اور انسان تینوں حیثیتوں سے کرا دیا گیا تھا۔ اساتذہ نے یہ منتخبات جس طرح پڑھائے اور سمجھائے تھے اس سے میرے ذہن میں غالب کی عظمت کا تاثر اسی زمانے میں پیدا ہو گیا تھا جو سرور ایام کے ساتھ برابر گہرا ہوتا گیا۔ دیوان غالب اکثر زیر مطالعہ رہنے لگا اور کچھ عرصے میں تقریباً سبھی اچھے شعرِ رباعی یاد ہو گئے۔ زندگی میں ایسیوں ہی ایسے تجربے اور مشاہدے پیش آئے جب کہ

صورتِ حال کی صحیح ترجمانی کے لیے غالب ہی کا کوئی شعر یاد آیا اور محسوس ہوا کہ شاید یہ شعر خاص اسی موقع کے لیے لکھا گیا تھا۔ خیالات و جذبات کی ہمہ گیری اور عام انسانی مسائل و کامرانی، آرزوؤں اور امنگوں کا حکیمانہ و شاعرانہ بیان جس میں امید و بیم، تمنا و شکست، تمنا، مسرت و الم، حسرت و کامرانی، رجائیت و قنوطیت، غرض ہر قسم کے احساسات و تاثرات کا احاطہ کر لیا گیا ہے، غالب کی یہی خصوصیت ہے جس نے میرے دل و دماغ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ لطاف کی بات یہ ہے کہ خواہ کوئی شخصی صورت حال ہو یا سماجی یا سیاسی یا فکری غالب ہی کے شعر مطابق حال معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ ہوں غالب نے ذیل کا شعر بظاہر محض حسن و عشق کے موضوع پر کہا ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

لیکن یہی شعر اس وقت بھی یاد آتا تھا جب آزادی ہند کی جد و جہد میں گاندھی جی نے ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کے ذریعے انگریزی حکومت سے لڑائی شروع کی تھی۔ یہی شعر اس وقت بھی یاد آیا تھا جب مرحوم رولست حیدر آباد

کے پر خلوص مگر جذباتی قائد سید قاسم رضوی بھارتی حکومت کے خلاف تقرروں کر کے لال قلمی پر آئینی جھنڈا لہرا دینے کے دعوے کیا کرتے تھے اور پھر یہی شعر زبان پر اس وقت آتا تھا جب عرب ملکوں کے سربراہ اسرائیل کے خلاف بلند بانگ دعوے کر کے اسے صفحہ ہستی سے نابود کر دینے کے عزم کا اعلان کرتے تھے۔ ان حالات کے علاوہ عام زندگی کے تجربات و مشاہدات میں بھی یہی شعر بیسیوں دفعہ یاد آیا ہے اور میں دل ہی دل میں حیران رہ گیا ہوں کہ غالب نے کیسے شگفتہ و دلکش انداز میں کیسی عمدہ بات کہی ہے جس کی پہلو داری کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ ہر اس موقع پر جب کہ یہ شعر یاد آیا ہے میں خود صورت حالات میں جذباتی و شخصی طور پر شریک (involved) کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اس شعر کے ذہن میں آنے ہی کو یا ایک طرح کی خارجیت (objectivity) پیدا ہو جاتی تھی جس سے جذباتی تناؤ دور ہو جاتا تھا اور میں دل ہی دل میں غالب کی طرح ہنس پڑتا تھا۔

اپنے آپ کو خود سے علیحدہ ہو کر دیکھنا اور اپنی کوتاہیوں اور حماقتوں پر ہنسنا، یہ بھی ایک ایسی خصوصیت ہے جو غالب سے مخصوص ہے اور غالب کا مطالعہ کرنے والوں میں بھی سراپت کر جاتی ہے۔ غالب کی اس خصوصیت

کا اندازہ بھی مجھے زمانہ طالب علمی ہی میں ہو گیا تھا جب سالک کے نام غالب کا وہ مکتوب پڑھا تھا جس میں وہ کہتا ہے ۔ ”اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں ، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کر لیا ہے ، جو دکھ مجھے پہنچتا ہے کہتا ہوں لو غالب کے ایک اور جوتی لگی ، بہت اترانا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں ، آج دور دور تک میرا جواب نہیں ، لے اب تو قرضداروں کو جواب دے ، سچ تو یوں ہے غالب کیا مرا بڑا کافر مرا آئیے نجم الدولہ بہادر ، ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ ، ایک قرضدار بھوگ سنا رہا ہے ، میں ان سے بوجھ رہا ہوں ابی حضرت نواب صاحب ، نواب صاحب کیسے اوغلان صاحب آپ سلجوتی اور افراسیابی ہیں ، یہ کیا بے حرستی ہو رہی ہے ، کچھ تو اکسو کچھ تو بولو ۔ بولے کیا بے حیا ، بے غیرت ، کوٹھی سے شراب ، گندھی سے کلاب بزاز سے کھڑا ، بیوہ فروش سے آم ، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا ، یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دونگا“ اور اسی زمانے میں وہ غزل بھی پڑھی تھی جس میں یہ شعر آتا ہے ۔

چاہئے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

غالب سے یہ رویہ سیکھنے کی وجہ سے زندگی کے کئے

ہی مرحلے آسان ہو گئے ، حسِ ظرافت جاگ اٹھی ۔ جن باتوں سے اور جن موقعوں پر عام طور سے اپنی انانیت و خود پرستی کے باعث غصہ ، جھنجھلاہٹ یا کوفت پیدا ہو جاتی ہے ایسے موقعوں پر غالب کے شعر یاد آ گئے اور غصہ یا جھنجھلاہٹ تو درکنار ہنسی کی ایک لہر دل میں دوڑ گئی اور ذہنی و جذباتی کھٹن فوراً دور ہو گئی ۔

غالب کی ہمہ گیری و پہلوداری اور حسِ ظرافت کے علاوہ جس چیز نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا ہے وہ ہے غالب کی انسانیت ، وسیع المشرب جو نہ صرف اس کی شاعری اور مکتوبات سے ہویدا ہے بلکہ عملی زندگی سے بھی ۔ نفع کو ایک خط میں کس خلوص سے لکھتا ہے ۔ ”میں تو بنی آدم کو ، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی ، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی کتا ہوں ، دوسرا مانے یا نہ مانے ۔ مذہب یا فرقے کی بنا پر جو تنگ نظری آدمی میں پیدا ہو سکتی ہے اس کو غالب کی شخصیت اور اس کی تحریروں کا مطالعہ دور کر دیتا ہے ۔ اس موضوع پر کیسے کیسے شعر کہے ہیں ۔

خوش بود فارغ ز بند کفر و ایمان زیستن
جیف کافر مردن و آو خ مسلمان زیستن

ہم سوحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملہیں جب مٹ گئیں اجڑائے ایمان ہو گئیں

نہیں کچھ سببہ و زباز کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

یہی وسعت قلب اور وسعت نظر غالب نے اور معاملات
میں بھی سکھائی ہے جس سے ہماری قدروں بلند تر ہو جاتی
ہیں اور ہمارے فکر و عمل کے محرکات بدل جاتے ہیں۔ کون
ہے جو غالب کے ان شعروں سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے؟
مجھے تو ایسے شعروں نے بہت متاثر کیا ہے۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبین کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لمے کر بہشت کو
گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بین ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا
ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جاسے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

غرض غالب نے پچھلے تیس برسوں میں نہ صرف میری
ذہنی، فکری و جذباتی رفاقت ہی کی ہے بلکہ رہنمائی بھی کی
ہے اور رفاقت و رہنمائی کا یہ سلسلہ اب بھی برابر جاری ہے۔
جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے، مطالعے اور مشاہدے میں
وسعت پیدا ہوتی جاتی ہے، غالب کی شخصیت اور اس کی

نمائف کے نئے نئے گوشے فکر و نظر کے سامنے آنے جاتے ہیں اور ہزار دفعہ پڑھے ہوئے شعر پھر نئے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ جس طرح کوئلے نے کہا تھا کہ ہر روز ایک نیا سورج طلوع ہوتا ہے اسی طرح میں دیوان غالب کے بارے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہر روز ایک نیا دیوان تخلیق ہوتا ہے۔ لیجیے اس پر غالب ہی کا ایک اور مطابق حال شعر یاد آ گیا۔

لوگوں کو ہے خورشید جہانناپ کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

صدیق کلیم

شروع ہی سے ہم یہ سنتے آئے تھے کہ غالب اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے۔ جب میں بی۔ اے کا طالب علم تھا تو میں اس رائے کا جس سے کہ مجھے اتفاق تھا تجزیہ کرنے سے قاصر تھا۔ اس وقت غالب کی غزلیں ہمارے دل و دماغ پر چھا جاتی تھیں اور اسی تاثر کو ہم اس کی عظمت کا ثبوت سمجھتے تھے۔ جب میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا تو میں نے ایسے سوالات کا جواب تیار کرنا شروع کیا۔ کم از کم ذاتی اطمینان کے لیے۔ اگر ہم ایک شاعر کو اچھا شاعر کہتے ہیں تو کن خصوصیات کی بنا پر؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنا مشکل ترین تنقیدی کوشش تھی۔ پہلے میں نے شیکسپیر کی عظمت کو متعین کرنا چاہا۔ اس لیے میں نے اس کے تمام ڈراموں کا مطالعہ کیا۔ چند تنقیدی کتابیں بھی پڑھیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شیکسپیر نے مختلف النوع کرداروں کی تخلیق کی ہے اور ہر واقعہ (خیال اور جذبہ جو اس واقعہ ہی میں جنم لیتے ہیں) کے مختلف النوع پہلوؤں کی رمزیہ تصاویر میں نشان دہی کی ہے۔ اسی سلسلے کی تکمیل ۱۹۴۷ء میں ہوئی

جب میں نے اردو میں شیکسپئر پر ایک کتاب لکھی -

اس طرح میں نے غالب اور اقبال کی عظمت کا تجزیہ بھی کیا - وہ کچھ اس طرح تھا - غالب نے مغلیہ ثقافت کی شان و نمکنت اور اس جیتی جاگتی زندگی کو جس نے اسے تخلیق کیا تھا اپنی شاعری میں سمو لیا ہے اس امتزاج میں وہ انتشار اور شکستگی بھی شامل ہے جو اس تہذیب ہی کی تخلیق تھی - اس لیے ذو معنویت غالب کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت ہے - اس زمانے میں ہم نے اردو کلاسیکل شاعری (ولی سے اقبال تک) کا بھی مطالعہ کیا تھا اس لیے غالب کی شاعری اس پس منظر پر اپنی تمام رعنائی کے ساتھ ابھرتی تھی - اس وقت مجھے یہ بھی خیال تھا کہ اقبال اردو کا عظیم ترین شاعر ہے نہ کہ غالب - شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ اقبال ہم لوگوں سے بہت نزدیک تھے - جب اقبال کی وفات ہوئی تو اس وقت ہم لوگ فرسٹ شاہر میں پڑھتے تھے - ہم نے ڈاکٹر ناہر مرحوم کو زار و قطار روئے ہوئے دیکھا - اس واقعے کا ہم پر بہت گہرا اثر ہوا - دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے ایسی شاعری میں فطرتاً بہت زیادہ دل چسپی تھی جو خیالات اور فلسفیانہ نظریوں سے جنم لیتی ہے - اقبال نے جس انداز میں اور جس سطح پر علمی مسائل کا تجزیہ کیا تھا اس نے ہم پر بہت گہرا تاثر چھوڑا تھا -

ان دنوں ہم جدید شاعری کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے۔ جوش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کا کلام ہمیں مرثوب تھا اگرچہ ذاتی طور پر میں حسرت موہانی کی شاعری کا انتہائی دلدادہ تھا۔ ان کے علاوہ فیض، راشد اور میرا جی ہمیں اچھے شاعر معلوم ہوتے تھے۔ یہ لوگ ہماری زندگی کے بہت قریب تھے۔ غالب اپنی عظمت کے باوجود ہماری زندگی سے بہت دور تھا۔ غالب کی میرے لیے کوئی ہم عصری قدر نہیں تھی۔ میں نے اپنی شاعری کے سلسلے میں بھی غالب سے کچھ نہیں سیکھا۔ ہم نے اُس فضا میں آنکھیں کھولی تھیں جس میں ایک نئی دنیا کی تخلیق پر زور تھا۔ اُس وقت انگریز سامراج کے خلاف بغاوت اپنے عروج پر تھی۔ اس دنیا نے ہمیں مثالیت پرستی سکھائی اور ایک قابل قدر آدرش بھی دیا۔

یوں تو غالب کا مطالعہ وقتاً فوقتاً کئی بار کیا ہوگا۔ لیکن اپریل ۱۹۵۱ء میں جب میں نے غالب کو پھر پڑھا تو مجھے یہ احساس ہوا کہ غالب شاید کوئی جدید شاعر ہے۔ اس وقت اس کی ذو معنویت اور ایماز و اختصار میں پوشیدہ ہلکا ہلکا طنز اور تلخی ہی صحیح طریقہ شعر گوئی معلوم ہوا۔ اس عرصے میں میں جدید انگریزی اور فرانسیسی شعرا کے کلام کا مطالعہ کر چکا تھا اور جدید شاداب شعری تکنیکوں اور ویران تجربات کی رہ گزاروں سے گذر چکا تھا۔ اس پس منظر پر

بھی غالب کی شاعرانہ تصویر ابھرنے لگی۔ اُس کی مزید تصاویر اور علامات نے اُس کے تجربے میں ویرانی اور شکستگی اور دردناکی کو جیسے میرے اپنے تجربت میں ڈھال دیا ہو اور وہ بھی ایک ایسی دنیا کے نقشے کے اندر جو خوب صورت ہی نہیں برفوار بھی تھی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ غالب میرے لیے اور میرے بعض احباب کے لیے بھی زندہ شاعر ہوتا چلا گیا۔ اب اس کے اشعار کی گہبہ پرنا ہم پر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔ جیسے کہ علم و ادب کے طلبا کو معلوم ہے افہام اور استحسان کی کئی سطحیں ہیں۔ غالب کو ہم اپنے ہی۔ اے کے زمانے میں بھی سمجھتے تھے۔ ہم نے اُس کی کئی شرحوں کا مطالعہ کیا تھا۔ شیخ ہد اکرام اور عبدالرحمن بھنوری کی تنقیدیں بھی دیکھی تھیں لیکن غالب کا یہ استحسان، یہ تجربہ* غالب، کہ غالب کی شاعری ہماری ہی زندگی سے عبارت ہے۔ یہ ہمیں کبھی بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ پاکستان میں صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ اقدار کی بڑھتی ہوئی شکست و ریخت ہمیں غالب کے قریب لے گئی۔ یا غالب کو ہمارے قریب لے آئی۔ زندگی کے ان بھیانک طور پر آداس لمحوں میں جب اتھاہ ویرانی چھا جاتی ہے :

سر بر ہجوم درد غریبی سے ڈالھے
وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

یا

شوریدگی کے ہاتھ سے سرے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

یا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

ہی عظیم شاعری معلوم ہوتی ہے یا اس سے کسی قدر
مختلف موڈ میں ۔

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنجہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

چنانچہ اس تجربے کا اظہار غالب پر اک مختصر مضمون
کی صورت میں ہوا جو پاکستان ریویو ۱۹۶۵ء کے غالب نمبر
میں شائع ہوا ۔ آج مجھے اقبال ہماری زندگی سے دور اور کبھی
بہت دور نظر آتا ہے اور غالب نزدیک ۔ کبھی بہت ہی نزدیک
غالب کے کلام کی سچ دھج اور اس کے اندر دردناکی ۔ شکستگی
اور انتشار جو تشکک کے مزاج میں گوندھ کر ہمارے سامنے
آتے ہیں درباری راگ کی سی نمکت اور وقار کے ساتھ ۔ مگر یہ
اس شاعر کا وقار ہے جو مرگ اور فنا کے فلسفے سے آشنا ہے ۔

اور یہ بھی کہ اس فنا میں بھی زندگی کرنا انسان ہی کا کام ہے۔ اس لحاظ سے میرے نزدیک غالب کے بے معنوی ادب (Literature of the Absurd) سے بھی ڈانڈے مل جاتے ہیں اور وجودیت (Existentialism) سے بھی۔ غالب زندگی کا رسیا ہے اور یہی زندگی کرنا اس کے فن کی جان ہے اگرچہ :

غم ہستی کا امد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوئے تک

لیکن

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد بھائی

اور

لکھتے ہیں ہے غم دل اس کو ستائے نہ بنے
کیا بنے بات چہاں بات بنائے نہ بنے
عشق ہر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لکے اور بجھائے نہ بنے

ڈاکٹر وزیر آغا

آج سے تقریباً چالیس برس پہلے کی بات ہے کہ ایک روز میرے والد کو بچانے کیا سوجھی کہ مجھے سیر کے بہانے گاؤں کے پرائمری سکول میں لے گئے اور پھر وہیں چھوڑ آئے۔ میں سکول کی دیواروں پر بنی ہوئی تصاویر کو دیکھنے میں اس قدر منہمک تھا کہ والد صاحب کے چلے جانے کا مجھے علم تک نہ ہو سکا اور جب علم ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی لقی و دق صحرا میں کھڑا ہوں اور میرے چاروں طرف بھیلی ہوئی زمین میں جلاد ایسی مونچھیں آک آتی ہیں۔ پھر دفعتاً یہ ساری مونچھیں سمٹ کر سکول کے ماسٹر صاحب کے بالائی ہولٹ کی عمارت پر جمع ہو گئیں اور میں نے حیرت سے دیکھا کہ ان مونچھوں سے ذرا اوپر دو ویران سے غار منہ کھولے کھڑے تھے اور ان غاروں سے ذرا اوپر دو سرخ انگارہ آنکھیں تیروں کی طرح اترتی میرے سارے بدن کو چھلنی کر رہی تھیں۔ چنانچہ حفاظتِ خود اختیاری کے تحت میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور آنسوؤں کے موئے موئے قطرے میرے گالوں پر لڑھکنے لگے۔

ان آنسوؤں کو دیکھتے ہی اُن لال انگارہ آنکھوں میں لغرت کی ایک تیز سی کٹار ابھری جس نے میرے آنسوؤں کی طغیانی کو اور بھی تیز کر دیا۔ مگر عین اس وقت ماسٹر صاحب نے دائیں بائیں ایک نظر ڈال کر اپنی جیب سے ایک نازک سی رنگین پنسل نکالی اور پھر جلدی سے میرے ہاتھوں میں تھا دی اور پنسل کے اس لس میں نجانے کیسا اعجاز تھا کہ میری ہلکوں پر چمکتے ہوئے آنسو وہیں رک گئے اور میرے ہونٹ ایک معصوم سی مسکراہٹ میں ڈوبتے چلے گئے۔ اُس وقت مجھے یوں لگا جیسے میں ایک بھیگی ہوئی چلن میں سے کسی روشن اور تاباک دنیا کا نظارہ کر رہا ہوں۔

اس واقعے کے کئی برس بعد جب میں کالج میں تعلیم ہاتے ہوئے ایک روز غالب کے دیوان سے متعارف ہوا تو مجھے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے زمانے نے ایک آلتی زہد بھری ہے اور میں واپس گاؤں کے ہرائیری سکول میں پہنچ گیا ہوں۔ غالب مجھے ایک پریشان حال لڑکے کے پیکر میں نظر آیا لیکن اس طور کہ اس کی ہلکی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھیں اور ہاتھوں نے انگنت رنگین پنسلیں تمام رکھی تھیں۔ غالب سے قبل میں نے فانی کا مطالعہ کیا تھا اور خود کو ایک ایسی سر زمین پر سرگردان پایا تھا جہاں بادلوں کا سائبان تھا ہوا تھا اور یہ سائبان کسی مجبور کی آنکھ کی طرح ہولے ہولے ٹپکتا چلا

جائا تھا ۔ پھر میں نے اکبر کا مطالعہ کیا اور مجھے یوں لگا
 جیسے میں کسی جلی جھلسی ہوئی کائنات میں ڈھکیل دیا گیا
 ہوں اور میرا سارا جسم سورج کی تیزشعاعوں سے ہارہ ہارہ ہو گیا
 ہے ۔ لیکن غالب کو ایک نظر دیکھتے ہی مجھے ہر سات کی وہ
 شام یاد آگئی جب موٹے موٹے بادلوں میں ایک شکاف سا
 پیدا ہو جاتا ہے اور اس شکاف میں سے سورج کی دزدیدہ
 نگاہیں ہر شے پر رنگوں کی جوالا انڈیل دیتی ہیں ۔ آنسو اور
 تبسم ایک دوسرے سے ہم کنار ہو جاتے ہیں اور زندگی اپنے
 دکھوں اور مصیبتوں کے باوجود نہایت خوبصورت ، لطیف اور
 قیمتی نظر آنے لگتی ہے ۔ مجھے غالب آنسوؤں میں مسکرانا ہوا
 دکھائی دیا ۔ وہ ایک ایسا انسان نظر آیا جسے بیک وقت غم
 اور خوشی کا عرفان حاصل ہو چکا ہو ۔ بعض شاعر خوشی سے
 اس درجہ ناراض ہو جاتے ہیں کہ ان کے ہاں غم کی گھری
 روشنی کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا اور بعض اندر سے تو
 ٹوٹ پھوٹ رہے ہوتے ہیں لیکن دنیا کو دکھانے کے لیے اپنے
 ہونٹوں پر تبسم کی ایک جہاز سی آویزاں کر لیتے ہیں ۔ غالب
 مجھے ان دونوں قسم کے شعرا سے مختلف نظر آیا ۔ مجھے محسوس
 ہوا غالب کے ہاں جس طرح غم فطری ہے اس طرح تبسم بھی
 خود رو ہے ۔ مطلب یہ کہ غالب رہا کار ہرگز نہیں ہے ۔ آئے
 جب جیہن محسوس ہوتی ہے تو رو ہڑتا ہے اور جب رونے رونے

محسوس کرتا ہے کہ کسی نے رنگین پنسل اس کے ہاتھ میں
 تھا دی ہے تو بے اختیار ہنسنے لگتا ہے ۔ مسکراہٹ کا یہ
 لمحہ جب غالب کا ازلی ابدی غم ایک نئی نویلی مسرت سے
 ہم کنار ہوتا ہے ۔ ایک ایسا نایاب لمحہ ہے جو غالب کو
 عام شعر کی سطح سے بہت اوپر اٹھا دیتا ہے ۔ زبان کا ایک
 شدید احساس اور پھر اس شدید احساس کی مضحکہ خیزی کا
 ایک گہرا شعور ۔ عرفان کا یہ مقام غالب ہی کو حاصل ہوا
 ہے اور غالب کے ذریعے ہی مجھ ایسے لاکھوں انسانوں تک
 پہنچا ہے جو زندگی کو اس کی الٹشوں اور مصیبتوں کے باوجود
 ایک بیش بہا نعمت سمجھتے ہیں ۔

میں نے اپنی زندگی میں غالب کے علاوہ اقبال کا بھی
 مطالعہ کیا ہے ۔ اقبال ایک عظیم شاعر ہے اور اس کی شاعری
 نے لاکھوں اذہان کو منزل سے آشنا کیا ہے لیکن میں اقبال
 سے مرعوب تو ہوا خود کو اس کے حلقہٴ احباب میں شامل
 کرنے پر کبھی مائل نہ کر سکا ۔ ہر بار جب میں نے اقبال
 کو پڑھا تو مجھے یوں لگا جیسے ریلوے سٹیشن پر آواز کے
 آئے سے یہ اعلان نشر ہو رہا ہو کہ ”مسافرو! جلدی کرو ،
 بھاگو ، دوڑ ، ۱۵ ، اپ ٹرین کے چلنے میں صرف پانچ منٹ باقی
 رہ گئے ہیں“ ۔ دوسری طرف غالب کا مطالعہ کرتے ہوئے میری
 چشم تصور نے دیکھا کہ اعلان کے شور اور انجن کے

اضطراب سے بے نیاز کوئی شخص ہلٹ فارم کے ایک شکستہ
 بئج پر اکڑوں بیٹھا کتاب کے مطالعہ میں غرق ہے۔ وہ اعلان
 کو سن کو ایک لحظہ کے لیے اپنی نظریں کتاب کے اوراق
 سے ہٹاتا ہے اور اپنے ہاس بیٹھے ہوئے دوسرے مسافر سے بڑے
 دھمے اور ملائم لہجے میں پوچھتا ہے ”جناب! اس کے بعد
 دوسری گاڑی کیسے بھی جائے گی؟“ — اور جواب پا کر بڑے
 اطمینان سے دوبارہ کتاب کا مطالعہ کرنے لگتا ہے۔ غالب کو
 کسی بات کی بھی جلدی نہیں۔ اس کے سامنے زندگی اپنی تمام تر
 سلوٹوں کے ساتھ بچھی ہوئی ہے۔ ہر سلوٹ ایک خواہش ہے
 اور ہر خواہش پر اُس کا دم نکلنے کو تیار ہے مگر ساتھ ہی
 آئے اس بات کا احساس بھی ہے کہ یہ ساری سلوٹیں بے معنی
 ہیں اور قدرت نے انسان کے ساتھ کوئی بہت بڑا مذاق کیا
 ہے! غالب کے سامنے نہ تو کوئی تعبیر کا منصوبہ ہے اور نہ
 آئے کسی ارفع منزل ہی کی تلاش ہے۔ آئے تو صرف اس
 قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے غرض ہے کہ آج کس دوست
 کا خط آیا یا شام کس طرح بسر ہوگی یا پھر اپنی ذات، اپنی
 انفرادیت کو زمانے کی آندھی سے محفوظ رکھنے کے لیے آج
 کیا تدارک کرنا ہوگا؟ غالب شخصیت کے بوجھل لبادے سے
 گریزاں لیکن انفرادیت کے چار گروہ کپڑے کا والد و شیدا
 ہے۔ وہ کسی دوسرے کے کنوئیں سے اپنے باغ کو سیراب

نہیں کرتا بلکہ اس کی آہاری اپنی ذات کے غنی چشموں سے
 کرتا ہے ۔ لیکن یہ ذات کیا ہے ؟ ایک جہاں ہوش رہا جو
 کسی مثال دار آئینے کی طرح ہزار لکڑوں میں ہٹ جانے کے
 باوجود آرزؤں کے ایک شہر کی صورت میں قائم ہے ۔ غالب
 جب اپنے اس آئینہ خانے سے مجھے آشنا کرتا ہے تو آواز کو
 دگنا کرنے والے آلے کا سہارا نہیں لینا بلکہ چپکے سے اپنا ہاتھ
 میرے شانے پر رکھ کر مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیتا ہے ۔
 یہ نہیں کہ وہ میرے اندر چھپے ہوئے ”دبدۂ عبرت نگاہ“
 کو متحرک ہی نہیں کرتا ۔ ضرور کرتا ہے مگر ساتھ ہی اپنی
 ایک آنکھ بیچ کر عبرت اور ندامت کے سارے تصور کو
 خندۂ استہزا میں بھی اڑا دیتا ہے ۔ مجھے ہمیشہ یہ غسوس
 ہوا کہ غالب ایک ایسا نقطہ ہے جہاں دو زمانے آ کر ملتے
 ہیں اور جہاں سے ایک تیسرا زمانہ اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے
 یا پھر یوں کہہ لیجیے کہ غالب وہ بھیگی سی مسکراہٹ ہے
 جو جلاد ایسی مولچھوں اور ہلکتے ہوئے آنسوؤں کے تصادم
 سے جنم لیتی ہے اور پھر ایک نئے عہد کا سہیل بن جاتی ہے ۔
 مجھے غالب کی یہ ٹٹ کھٹ معصوم اور بے داغ ادا پسند ہے
 کہ اس میں زفاقت کا احساس بھی ہے اور عرفان کے کوندے
 کی لہک بھی !

جیلانی کامران

میں نے ”استانزے“ کے پیش لفظ میں غالب کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ یہ پیش لفظ ۱۹۵۷ء میں ایڈیٹر میں لکھا گیا تھا اور جو کچھ اس میں کہا گیا تھا اس سے ایک نئی شعری زبان کو دریافت کرنا مقصود تھا۔ میں نے نئی شعری زبان ہی کے ضمن میں غالب کا ذکر کیا تھا اور لکھا تھا کہ غالب در حقیقت ایک ایسے تخیل کی نمائندگی کرتا ہے جو ہر اعتبار سے آزاد ہے اور جس کے سامنے ہر نوع کی پابندی بے معنی ہے۔ نئی اردو شاعری کے مطابق غالب ایک پابند شاعر ہے اور غزل کے پیرائے میں گفتگو کرتا ہے اور شعر کے بارے میں جس عقیدے کو مانتا ہے وہ الہامی انداز فکر کا پیدا کیا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب میں غالب کے آزاد تخیل کا ذکر کرتا تھا تو میں نے ان سچائیوں کا انکار نہیں کیا تھا۔ غالب کی شعری زبان میرے خیال میں، لفظ اور معنی کے مربوط ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی نہ تو لفظ باقی رہتا ہے اور نہ معنی ہی قائم رہتا ہے بلکہ ان دونوں کے ربط سے استعارہ پیدا ہوتا ہے۔ عام حالات میں استعارے کی

موجودگی تخیل شعری کا باعث ہوتی ہے۔ آزاد تخیل اس لیے زیادہ قیمتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے استعارہ وضع کرنے کی حدود کا تعین نہیں ہو سکتا۔ غالب کی شعری زبان کا چہرہ استعاروں کا چہرہ ہے۔ اور یہ استعارے غالب کی شاعری کو مقام و وقت، زمانے، شاعری کے بدلنے ہوئے رجحانات سے بے نیاز کرتے ہیں۔ میں جس سچائی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ زبان اور آزاد تخیل کے باہمی عمل سے شعری زبان پیدا ہوتی ہے۔ ”استائزے“ کے ذریعے میرے سامنے کچھ ایسا ہی مقصد تھا۔

میری ذہنی اور فکری تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی اس میں حلقہٴ اربابِ ذوق اور ترقی پسند تحریک کے منظریات کی بڑی اہمیت تھی۔ ۱۹۴۷ء تک حلقہٴ اربابِ ذوق، شاعر کی اندرونی کائنات کا ذکر کرتا تھا اور ترقی پسند تحریک افراد کے عذاب اور آشوب سے موضوع اخذ کرتی تھی۔ میں جس زمانے کا ذکر کر رہا ہوں، اور جب میں نے ”استائزے“ کا پیش لفظ لکھا تھا، اس وقت میرا فکری اور ادبی ماحول بہت حد تک بدل چکا تھا، اور مجھے اپنی تربیت کے ابتدائی اثرات کچھ زیادہ مفید دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ایسے زمانے میں میرا کلام غالب سے دوبارہ تعارف ہوا۔ مجھے غالب کے کلام میں آزاد تخیل کے ساتھ ساتھ اضافی دکھائی دیں اور محسوس

ہوا کہ غالب اضافتوں کی مدد سے جہاں اختصار پیدا کرتا ہے وہاں یہ اضافتیں درحقیقت تخلیقی تصورات کی لامحدود زرخیزی کو محفوظ بھی کرتی ہیں۔ میں نے کئی بار اضافتوں کو کھول کر اشعار کی صورت دیکھی تو مجھے تصورات کے ایسے علاقے دکھائی دیے جن سے میری پہلے آشنائی نہیں تھی۔ اس وقت میں نے خیال کیا کہ اضافتوں کے مجھے تصورات کی موجود دنیا، نئی اردو شاعری کے لیے بے حد مفید ثابت ہو سکتی ہے کیونکہ یہ تصورات متحرک ہیں اور ان کی حرکت موجود سے موہوم کی جانب ہے۔ لیکن جو بات عجیب دکھائی دی یہ تھی کہ ان تصورات کی حرکت سے موہوم، موجود بنتا تھا اور موجود کی سرحدیں پھیلتی تھیں۔ غالب کی شاعری میں مجھے ایک ایسا انسان دکھائی دیا جو موجود کو موہوم پر فتح پاب ہوئے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ نئی اردو شاعری بھی موجود کی سرحدوں کو پھیلانے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ اور اس طرح مغربی شاعروں سے کہیں زیادہ غالب کی احسان مند ہے۔

غالب غالباً پہلا اردو شاعر ہے جو سوال پوچھتا ہے اور ان سوالوں کی روشنی میں اپنی واردات کو ترتیب دیتا ہے۔ سوال پوچھنے کا یہ طریقہ مجھے غالب کی شاعری میں اس لیے پسند آیا کیونکہ ان سوالات کی مدد سے شاعر اپنے تجربے کو

پہچاننے پر قادر ہوتا تھا۔ نئی اردو شاعری میں جہاں کہیں ذات کے حوالے سے سوالوں کو اٹھایا گیا ہے وہاں اس طریق کار کے پیچھے غالب ہی کا طریق کار مصروف عمل ہے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ نئی اردو شاعری کی تنقیدی وضاحت کا فرض بڑی حد تک بھہہ پر رہا ہے اور میں نے ان وضاحتوں کے لیے جن تجربات اور شعری علوم سے استفادہ کیا ہے ان میں غالب کے اس طریق کار کی حیثیت مرکزی ہے۔

بارہ چودہ برس کی شعری کارگزاری کے بعد یہ کہنا مشکل ہے کہ میں نے اپنے طور پر غالب سے کہاں تک استفادہ کیا ہے۔ تاہم ایک سرسری انداز میں یہ سچائی بھی واضح کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ”استانزے“ کی ایک نظم میں، میں نے ”دل پر قطرہ ہے ساز انا البحر“ ہی سے تجربے کی نشاندہی کا آغاز کیا تھا۔ اس بند کا تذکرہ مناسب دکھائی دیتا ہے بند یہ ہے :

”میں دسمبر کا خنک ہاتھ تو اپریل کی کلی،
تو ستاروں کی خریدار، میں خواہاں تیرا
دسترس تجھ کو، نہ حاصل مجھ کو!“
عمر شبنم کا بدن چوم چکی ہے تجھ پر
بند کلیوں کی طرح تو ہے کشش آج مجھے
ہے دل قطرہ اگر بحر، تو ساحل مجھ کو!“

میں نے غالب کے فکری اثر کو ظاہر کرنے کے لیے آخری سطر کے پہلے حصے کے نیچے لائن کھینچ دی ہے ۔

یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ غالب کی شاعری علمی ہے ۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ شاعری کتابوں کی شاعری ہے ۔ غالب کی شاعری میں غزل ، داستان اور فلسفے کی ترکیبیں اور اصطلاحیں علامتوں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں ۔ غالب ان علامتوں کی مدد سے عشق کو نہ صرف سمجھنے کی کامیاب کوشش کرتا ہے بلکہ ان علامتوں کی مدد سے عشق کو دریافت مہیوم کی خاطر استعمال بھی کرتا ہے ۔ اور اس طرح عشق مہیوم کو موجود میں بدل دیتا ہے ۔ صحرا ، وحشت ، یابان اور باغ کی حیثیت خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے ۔ یہ اصطلاحیں تجربے کے مقامات کو بیان کرتی ہیں اس کے علاوہ غالب کی شاعری میں ”قبلہ نما“ کی جانب ایک سفر کا ذکر بھی ہے ۔ قبلہ نما کو موجود میں قائم کر کے غالب ”قبلہ“ کی دریافت کرتا ہے اور اس طرح ایک ایسے وجود کی طرف اشارہ کرتا ہے جسے اس نے الہی صفات میں مشاہدہ کیا ہے ۔ غالب کا محبوب اس اعتبار سے مذہبی اصطلاحوں کے ”خدا“ سے کم اور انسان سے بلند تر مرتبے کا حامل ہے ۔ میں اپنی رائے کی حمایت میں ”ولی پوشیدہ اور کافر کھلا“ کو پیش کرنا نہیں چاہتا ۔ لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ غالب کی شاعری میں

سیکولر انسانی واردات کو مجاز و حقیقت کی مذہبی زبان میں بیان کیا گیا ہے اور اس طرح مشاہدے کو موجود اور وجود کے اتصال کی صداقت کے طور پر پیش کیا ہے ۔

فکری طور پر ایسا طریق کار در حقیقت دو مختلف دنیاؤں کے مابین رابطے کو پیدا کرتا ہے ۔ غالب کی شاعری میں سیکولر واردات وحدت الوجود کی اصطلاحوں کے ذریعے شہود کو ”غیبِ غیب“ میں بدل دیتی ہے اور اس طرح دو محبوب وضع کرتی ہے ۔ ایک کی صورت زمینی ہے اور دوسرے کی صورت غیر زمینی ہے ۔ یہ دوسری صورت نہ تو خدا کی مظہر ہے اور نہ انسان کے نقش میں ظاہر ہوتی ہے یہ صورت بیک وقت مہیوم ہے اور بیک وقت ظاہر ہے غالب کی شاعری میں ظاہر اور مہیوم کی ایسی کیفیت سمجھنے پر اعتبار سے منفرد اور قابل ستائش دکھائی دی ہے ۔

اتنا کچھ کہہ کر یہ کہنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ غالب کی شاعری میں جن دنیاؤں کی جالب میں نے مختصراً اشارہ کیا ہے جی دنیائیں نئی اردو شاعری میں از سر نو برآمد ہو رہی ہیں ۔ میں نے اور میرے ساتھ دوسرے اردو شاعروں ، مثلاً افتخار جالب ، عباس اطہر ، انیس ناگی زاہد ڈار اور فاروق حسن نے ہمہ اوست یا ہمہ از اوست کو قائم کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ موجود کی سرحدوں پر مہیوم کو لباس پہننے کی آرزو

کی ہے ۔ اور اس طرح زمین کے سکھائے ہوئے علوم کی مدد سے ایک غیر زمینی علاقہ ، دریافت کیا ہے یہ غیر زمینی علاقہ جیسا میں پہلے کہہ چکا ہوں ۔ میں نے سب سے پہلے غالب کی شاعری میں دیکھا اور اس کے اجزائے ترکیبی بھی وہی ہائے ۔ اور پھر نئی اردو شاعری کی تحریک میں جو کچھ طے پایا اس کے خد و خال ، ہر چند کہ غالب سے مستعار دکھائی نہیں دیتے ، تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ غالب نے ضمیر متکلم کو جس قوت سے آشنا کیا تھا وہی قوت نئی اردو شاعری میں کار فرما ہے ۔ نئی اردو شاعری اپنے مزاج ، طریق کار ، اور دریافت مہوم کی کوششوں میں غالب کے عظیم شعری فکر کو دہراتی ہے ۔

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

ادھر ”بھاس یاد گار غالب“ کی یہ تاکید کہ ”ایک ہزار الفاظ کے اندر اندر یہ بیان کر دیا جائے کہ غالب نے آپ کی ذہنی فکری اور جذباتی زندگی کو کس عنوان سے متاثر کیا ہے“
ادھر اظہار خیال کرنے والوں کو غالب کی یہ تہدید کہ

گنجینہ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب میرے اشعار میں آوے

بڑی کٹھن منزل ہے لیکن تاثر بھی تو ایسی چیز نہیں
جسے آدمی چھپا جائے۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے سب
اس کے اظہار پر عبور ہیں اور اسی عبوری کے ہاتھوں مجھے
کہنا پڑتا ہے کہ میں غالب کے اس دعویٰ ثبوت پر :

گر شعر سخن بہ دھر آئین بودے
دیوان مرا شہرت پروین بودے
غالب اگر آئین فن سخن دین بودے
آن دین را این کتاب آئین بودے

اسوقت ایمان لایا ہوں — ع

”کہ مجنون لام الف لکھتا تھا دیوار دیستان پر“

ہوا یہ کہ تعلیم و تربیت کے ابتدائی دور سے لے کر سن بلوغ تک گھر اور گھر کے باہر مجھے جس قسم کا ادبی ماحول میسر آیا اس میں غالب کا ذکر اتنی شدت اور اتنی کثرت سے سننے کو ملا کہ وہ ذہن کے لاشعوری خانے کا جزو بن گئے۔ جیسے جیسے شعر و سخن کو سمجھنے اور اس سے لطف النور ہونے کی اہلیت بڑھتی گئی، میرا ایمان ان کی نبوت پر پختہ ہوتا چلا گیا اور ایک دن وہ آیا کہ زندگی اور ادب کی اکثر منزلوں میں وہ میرے راہنما اور مشکل کشا بن گئے۔ اگر تعالیٰ سے تعبیر نہ کریں تو سمجھ لیجیے کہ اردو شاعری کی دنیا میں ہر تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور چلنے کی زحمت میں نے نہیں اٹھائی بلکہ آغاز سفر ہی میں راہبر کو پہچان لیا تھا۔ اس راہبر نے میری جذباتی فکری اور ذہنی دنیا کو کس کس انداز سے متاثر کیا ہے، اس تفصیل کی گنجائش کہاں مجھلا اس قدر عرض کروں گا کہ زندگی اور شعر و ادب کے باپ میں جتنا کچھ میں نے غالب سے سیکھا ہے اردو و فارسی کے کسی شاعر سے نہیں سیکھا۔

شاعری قافیہ پیمائی نہیں معنی آفرینی ہے، حمزہ کا قصہ نہیں دل گداختہ کی تفسیر ہے۔ لڑکوں کا کھیل نہیں، جزو میں کل کی نمائش ہے۔ قد و گیسو کی آرائش نہیں دار و رسن کی

آزمائش ہے ، دشمن و غنجر و باد و ساغر کا تذکرہ نہیں ،
مشاہدہ حق کی گفتگو ہے ۔ اسی طرح کی بہت سی باتوں کا
شعور و احساس ابتداً مجھے غالب ہی سے ملا ہے ۔

فلسفہٴ جدلیات اور کرسیمہٴ اضمحلال اور زندگی و ادب کے
رشتوں کے متعلق پیگل اور میتھو آرنلڈ سے لے کر علامہ
اقبال و محنوں گور کھپوری تک پڑھنے کو تو کیا کچھ نہ
پڑھا تھا لیکن ذہن سے بڑھ کر دل میں بات اس وقت آتری
جب غالب کے اس نوع کے شعر سامنے آئے ۔

کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی
ہوئی زنجیر موجِ آب کو فرصتِ روائی کی

لطافت بے کثافت جاوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا
گھر پہارا جو نہ روئے بھی تو ویران ہوتا
بھر کر بھر نہ ہوتا تو لیاہان ہونا

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

محاکات شعری اور قہیئل کی گلکاری و رسانی کے بارے میں
مقدمہٴ شعر و شاعری اور شعرالعجم میں بہت کچھ پڑھا تھا ۔
لیکن ذوق کی ترقی اور ذہن کی سیرابی کا سامان اس وقت میسر

آیا جب غالب کے اس قسم کے اشعار نظر سے گزرے :

”لیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہے
تیری زلفیں جس کے شانے پر پریشان ہو گئیں

رنگِ شکستہ صبحِ چار نظارہ ہے
یہ وقت ہے شکفتنِ گلہائے ناز کا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے برے ہوتا کاش کہ مکان اپنا

زندگی کی کہا گہمی اور کارِ جہان کی درازی کی خبر
دوسرے شاعروں نے بھی دی تھی لیکن اس خیال کا سجا لطف
اس شعر کے بعد نصیب ہوا :

خون ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اب تک
رہنے دے ابھی ہاں کہ مجھے کام بہت ہے

معاشی عدم مساوات کی لعنتوں ، مزدور پر سرمایہ دار
کی سختیوں اور کسان پر جاگیردار کی زبردستیوں کے قصے
صرف چپ نہیں کہ پڑھے یا سنے تھے بلکہ اس قسم کے واقعات
آنکھوں سے دیکھے تھے لیکن جب تک غالب کا درج ذیل شعر
نظر سے نہ گزرا تھا افلاس و ناداری پر دولت و سرمایہ کے
جبر و استبداد کا پورا احساس نہ ہوا تھا ع

غارت گرِ لاسوس نہ ہو گر ہوسِ زر
کیوں شاہد گلِ باغ سے بازار میں آوے

رجائیت کے انتہا پسند مبلغوں نے زندگی کو یکسر نشاط اور قنوطیت کے ازی طرف داروں نے اسے یکسر غم ثابت کر دکھانے کی کیا کیا کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن جب غالب کے اس قسم کے اشعار سامنے آئے :

آگ سے ہانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
فالے سے وا ماندگی میں ہر کوئی ناچار ہے

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

تب اندازہ ہوا کہ فطرت انسانی اور لازمہ "بشریت" سے دونوں بے خبر ہیں زندگی حقیقتاً ایک سے نہیں غم اور خوشی دونوں سے عبارت ہے۔

ایجاز و اختصار اور معنی خیزی و معنی آفرینی کی تعریفیں پہلے بھی پڑھی تھیں لیکن اس قسم کے اشعار سے پہلے :

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افکنِ عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

یہ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کوڑے میں مسندِ بند کرنا کسے کہتے ہیں اور محذوفات و مقدرات شعر کی تاثیر کس طرح بڑھا دیتے ہیں۔

حیات و کائنات اور اس کے ارتقا کے متعلق ڈارون اور دوسرے مفکرین کے توسط سے کیا کچھ نہ سن رکھا تھا لیکن

یہ راز کہ غزل میں ان خیالات کا حیات افروز اور نشاط خیز
مصرف کس طرح ہونا چاہیے ذیل کے اشعار سے منکشف ہوا ۔

زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسمان کے لیے

آرائشِ جہاں سے فارغ نہیں ہنوز
بہرِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب ہیں

فلسفیانہ طرزِ فکر اور حکیمانہ اسلوب کے متعلق یہ تو سن
رکھا تھا کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے ہمیشہ استدلال کے ساتھ
کہتا ہے جو دعویٰ کرتا ہے ثبوت کے ساتھ کرتا ہے لیکن
شنیدہ کو دیدہ کی حیثیت کچھ اس قسم کے اشعار کے بعد
نصیب ہوئی :

لہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے لہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہ کہہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ
کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہا کیوں ہو

دیر نہیں حرم نہیں ، در نہیں آستان نہیں
بٹھے ہیں رہگزر یہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیونکہ

طنز و طراقت کے سلسلے میں جعفر کی زلییات سودا کی
ہجویات اور انشا و مصحفی کی خرافات سبھی کچھ نظر سے
گزری تھیں لیکن اس طرزِ خاص کی حلاوت و حذاقت اور لطافت

و افادیت اس وقت سمجھ میں آئی جب مرزا نوشہ کے اس نوع کے اشعار مطالعہ میں آئے۔

قیسہ بغیر مرثدہ سکا کوہکن اسد
سرگشتہٴ خارِ رسوم و قیود تھا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو منظور تنکِ ظرفِ منصور نہیں

کرنی تھی ہم پہ برقی تھیلی نہ، طور پر
دیتے ہیں بادہِ ظرفِ قدحِ غوار دیکھ کر

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

شہیدہ ای کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم
بہ ہیں کہ بے شرر و شعاع می توانم سوخت

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خبر ہوئی
گر بکڑ جاتا تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

لفظ و معنی کے ربط باہمی پر بہت کچھ پڑھا تھا اور شاعری میں رعایتِ الفاظ کی حسنِ خیزی کے متعلق ”حداائق السحر“ سے لے کر ”المعجم“ تک بہت کچھ سمجھا تھا لیکن جب تک یہ اشعار:

شور بندِ ناصح نے زخمِ ہر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی ہوجھے بچم نے کیا مزہ پایا

غم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد تھے
کرتا ملک الموت کھانا کوئی دن اور

عرض کیجیے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

نظر سے نہ گزرے تھے رعایت لفظی کو عیب کے سوا ہنر
کہنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ رجائیت اور رجائی نقطہ نظر کے
متعلق فلسفہ و نفسیات کی بحثوں اور اقبال کے سلسلے کی کتب
و مقالات میں بہت کچھ پڑھا تھا لیکن یہ نکتہ کہ شعر و ادب
میں اس نقطہ نظر کو کس سطح پر اور کس انداز سے دخیل
ہونا چاہیے، غالب کے ان اشعار کے بعد سمجھ میں آیا۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

بے تکلف دو ہلا ہون بہ از بیم ہلاست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

غرض کہ غالب اور کلام غالب نے فکر و فن کے
ان کثرت لکھے سمجھائے ہیں ذہن کے نہ جانے کتنے گوشوں کو
منور کیا :

”چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہوجانا،“

کی معرفت نے میری فکری اور جذباتی زندگی کو کسی ایک

عنوان سے نہیں سیکڑوں عنوان سے متاثر کیا ہے ۔
لیکن یہ تاثر :

”اے کاش کبھی معرض اظہار میں آوے“

غالب میرے دو تین نہایت پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں۔ مجھے اردو کے بڑے شاعروں میں غالب کے علاوہ میر اور اقبال بھی بہت عزیز رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص مجھے یہ بتانے پر مجبور کرے کہ ان تینوں میں سب سے زیادہ کون پسند ہے تو غالباً میں غالب ہی کا نام لوں گا۔ میں ان تینوں کی تقابلی عظمت کے بارے میں کسی قطعی فیصلے تک نہیں پہنچ سکا ہوں۔ حسن عسکری اپنی قہرروں میں میر کو غالب پر ترجیح دیتے نظر آتے ہیں اور ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے مجھے اقبال غالب سے بہتر معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن غالب کی شاعری میں کئی خصوصیتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر مجھے غالب میر سے زیادہ دلکش اور اقبال سے زیادہ دیرپا شاعر محسوس ہوتے ہیں۔ بہر حال میں یہاں یہ فیصلہ کرنے نہیں بیٹھا کہ میر غالب اور اقبال سے سب میں بڑا شاعر کون ہے۔ مجھے اعتراف یہ کرنا ہے کہ اردو کے بڑے شاعروں میں سب سے زیادہ غالب کو چاہنے کے باوجود میں اس جاہت کی ذمہ داریوں کو آج تک پورا نہیں کر سکا ہوں۔ غالب سے

میری واقفیت ویسی نہیں ہے جیسی غالب کے ایک منجیدہ طالب علم کی ہوتی چاہیے۔ اور غالب ہی پر کیا منحصر ہے اپنے حالات (اندوہ فرصت یک طرف ذوق مماشایک طرف) کے باعث میں کسی بھی ادیب یا شاعر سے عاشقانہ دلچسپی کے باوجود اس کا عارفانہ ادراک حاصل نہیں کر سکا ہوں۔ پندرہ برس سال سے تنقید نگاری کی مشق کے باوجود مجھے آج تک غالب پر تنقیدی مضمون لکھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ اور آج میں غالب پر کچھ لکھ رہا ہوں تو صرف اس لیے کہ مجلس یادگار غالب کی فرمائش کے مطابق مجھے غالب پر تنقیدی مضمون نہیں لکھنا ہے بلکہ غالب پر لکھنے کے بجائے ایسے نثرات و خیالات پیش کرنے ہیں جو غالب کی شاعری کے مطالعے سے میرے دل و دماغ میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے ہیں۔

غالب اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں جو انسانی جذبات و نفسیات کی مصوری میں غیر معمولی مہارت کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری میں انسانی جذبات و نفسیات کے لطیف ترین پہلوؤں کا حسین ترین اظہار ملتا ہے جس سے دوسروں کی طرح میں بھی لطف اندوز ہوتا رہا ہوں۔ لیکن میری جذباتی زندگی پر ان کا جو شعر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا ہے وہ ایک ایسا شعر ہے جسے خیال یا بیان کسی اعتبار سے بھی ان کے

نہایت اچھے شعروں میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود ان کے اس شعر میں ایک ایسی نفسیاتی صداقت پائی جاتی ہے جس کی طرف غالباً غالب کے سوا اردو کے کسی اور شاعر کی نظر نہیں گئی۔ شعر یہ ہے

وفائے دلبران ہے اتفاق ورنہ اے ہمدم
اثر فریاد دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر محبوب کی بے التفاتی اور بے وفائی کی عام رسمی شکایت ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس شعر میں انسانی نفسیات کا ایک نہایت لطیف نکتہ پوشیدہ ہے اور اس نکتے کی طرف شاید میری نظر بھی نہ جاتی اگر میں اپنی جذباتی زندگی میں اس تجربے سے نہ گزرا ہوتا جو اس شعر کا نفس مضمون ہے۔ میرے ذاتی تجربے نے مجھ پر اس شعر کی معنویت کو روشن کیا اور اس شعر نے میرے ذاتی تجربے کی نوعیت کو مجھ پر واضح کیا۔ سوال یہ ہے کہ وہ نفسیاتی نکتہ اور ذاتی تجربہ جو اس شعر کا موضوع ہے کیا ہے۔

لاہوتا یہ ہے کہ جب کسی کو اپنی محبت کا جواب محبت سے ملتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میرا خلوص رنگ لایا۔ میری محبت اور میری دل سوزی محبوب کے دل پر اثر کیسے بغیر نہ رہ سکی۔ اس لیے وہ مجھ پر ملنفت اور مہربان ہو گیا۔ لیکن

دو دلوں کے اتصال و اتحاد میں اتفاق کا عنصر جو کردار ادا کرتا ہے اس کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی اور اگر جائے بھی تو انسانی فطرت شاید ہی اتفاق کے کردار کا اعتراف کرنے پر آمادہ ہو۔ محبت کے معاملے میں اتفاق کے کردار کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ جس طرح آپ کو کسی کی ذات میں بعض ایسی خوبیاں محسوس ہوتی ہیں جن کی بنا پر آپ اپنا دل لٹا کر بیٹھتے ہیں اسی طرح جب تک دوسرے فریق کو آپ کی ذات میں ایسی خوبیاں محسوس نہ ہوں جو اس کو آپ کی طرف کھینچ سکیں اس وقت تک وہ آپ کی صرف جان لٹاری اور دل لٹاری سے متاثر نہیں ہوتا۔ وہ آپ کے جذبات محبت کی قدر کر سکتا ہے۔ لیکن وہ آپ سے محبت نہیں کر سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آپ کی محبت کو اپنے لیے ایک مصیبت تصور کرنے لگے۔ جوابی محبت کے لیے قطعاً ضروری ہے کہ محبوب کو بھی آپ کی ذات میں کوئی ایسی چیز مل جائے جو اس کو آپ کی طرف کھینچ لے یا کھینچ سکے۔ اب یہ اتفاق نہیں تو اور کیا ہے کہ جس طرح آپ کو کسی کی ذات میں کوئی خصوصیت باعث کشش محسوس ہوئی اسی طرح اس کو بھی آپ کی ذات میں کوئی چیز پرکشش نظر آئی۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا یک طرفہ محبت کا سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ اور یک طرفہ محبت میں تمام دل سوزی اور جان لٹاری بے سود ثابت ہوتی

ہے ۔ آپس اور کراہیں اگر محبوب کے دل کو متاثر کرتی بھی ہیں تو اس حد تک نہیں کہ وہ اپنے عاشق کو محض اس کے حال زار کی بنا پر چاہنے لگے ۔ عاشق کی زبانوں حالی محبوب کے دل میں ترجمہ پیدا کر سکتی ہے لیکن محبت نہیں ، یہی وہ عوامل ہیں جن کی بنا پر غالب کو کہنا پڑا کہ اثر فریاد دہائے حنین کا کس نے دیکھا ہے ۔ ان تمام باتوں کی بنا پر یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ عاشق کے محبوب کی محبت عاشق کی دیوانگی اور دل سوزی سے زیادہ حسن اتفاق پر منحصر ہوتی ہے ۔ اس اعتراف کے معنی یہ ہیں کہ محبت کے معاملے میں حسن اتفاق عشق سے زیادہ اہم اور فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ عام انسانی فطرت اس ناخوش گوار حقیقت کے اعتراف پر آمادہ نہیں ہو سکتی ۔ میں چوں کہ طبعاً زندگی کی تلخ سے تلخ حقیقت کا اعتراف کرنے پر آمادہ رہا ہوں اس لیے مجھے اپنی جذباتی زندگی میں اپنے خلوص ، اپنی دل سوزی اور جان فروشی کی بے مالگی اور بے اثری کا اعتراف کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی ۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے غالب کے مندرجہ بالا شعر کو زندگی کی ایک اہم حقیقت کے ادراک میں معاون پایا اور باوجود اس کے کہ میں اسے غالب کے بہترین شعروں میں شمار نہیں کرتا مجھے ان کا یہ شعر بے حد عزیز ہے ۔ اے کچھ تو اس شعر کا اثر کہے اور کچھ

ذاتی تجربے کا لیضان کہ اس موضوع پر میں نے بھی دو
شعر کہے

اتفاق ہے دو دلوں کا ملاپ
کون سنتا ہے ورنہ کس کی ہیکار
ملفت خود نہ ہو اگر کوئی
آہ بے سود اور فغان ہیکار

زندگی میں کامیابی کا راز کیا ہے ؟ کامیابی کے تصور کے
اعتبار سے اس سوال کے کئی جواب ہو سکتے ہیں ۔ لیکن ان تمام
جوابوں میں غالباً ایک بات مشترک ہوگی ۔ وہ یہ کہ آدمی
اپنے حدود کو پہچانے اور ان حدود کے اندر رہ کر عمل
کرمے ۔ معمولی صلاحیتوں کے لوگ انتہائی محدود دائرے کے
اندر سرگرم عمل رہا کرتے ہیں ۔ ان کی زندگی کا مقصد کوئی
امتیازی کامیابی حاصل کرنا نہیں بلکہ صرف جسم و جان کے
رشتے کو برقرار رکھنا یا اس قسم کی دوسری ضروریات زندگی
کو پورا کرنا (مثلاً بال بچوں کی پرورش ، ان کی شادی وادی)
ہوتا ہے ۔ لیکن ذہین اور حوصلہ مند لوگ اپنی صلاحیتوں سے
بدرجہا زیادہ کر گزرنا چاہتے ہیں ۔ ایسوں کے عمل میں ارتکاز
کی کمی انہیں لے ڈالتی ہے ۔ زندگی میں کامیابی اور شادکامی
کے لیے ضروری ہے کہ اگر آدمی غیر معمولی ذہانت اور
صلاحیت کا مالک ہو تو ایک سے زائد میدانوں میں تک و دو

کرے ورنہ کسی ایک مخصوص نصبالعین پر اپنی محدود ذہانت اور صلاحیت کو مرکوز کر دے۔ یہ زندگی کا ایک سنہرا اصول ہے جس پر میں عمل کر سکوں یا نہیں لیکن اس کی صحت، صداقت اور افادیت کو محسوس ضرور کرتا رہا ہوں میرے ذہن پر زندگی یا کامیابی سے متعلق یہ لکتہ غالب کے اس شعر کی بدولت روشن ہوا

از ہرزہ روان کشتن قلم نہ توان کشتن
چو بہ خیابان روسیلی بہ بیابان شو

میں پیشے کے اعتبار سے معلم ہوں اور اپنی ادبی سرگرمیوں کے اعتبار سے شاعر اور انشائیہ نگار ہونے کے علاوہ تنقید نگار بھی۔ تدریس و تنقید میں جو اصول میرے لیے دستور العمل کی حیثیت رکھتے ہیں وہ میں نے غالب ہی کے اشعار سے اخذ کیے ہیں۔ غالب کے ان اشعار سے سمجھ لیجئے کہ وہ اصول کیا ہیں

آوازہ معنی را بر ساز دبستان زن
ہنگامہ صورت را باز بچہ طفلان شو

تو امے کہ محو سخن گستران پیشینی
مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست